9 ۱۱۵۶

استاد مرحوم حضرت آیۃ اللہ

مرتضیٰ مطہری شہید

از نشریات

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، کراچی

ب

مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجده می خواهی ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

پیش لفظ

استاد شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہری مرحوم کا انقلاب اسلامی ایران پر یقیناً بہت بڑا حق ہے اور اس انقلاب کی کامیابی حضرت امام خمینی کے بعد زیادہ تر انہی کی کوششوں کی مرہون منت ہے صدق وصفا کا یہ پُتلا اور خلوص و دیانت کا مجسمہ یہ عظیم دانشمند اپنی فیض رساں زندگی کی پوری مدت قافلہ سالار علماء و فضلائے عصر رہا اور ایران کی یونیورسٹیوں اور حوزہ ہائے علمی کے تعلیمی مناہج کو اپنے نور ہدایت و بصیرت سے روشن کرتا رہا اس عالم ربانی کے بیانِ علم و فضل سے گلستانِ دین میں بہارِ جاوداں کی آمد کے عمل کو بڑی قوت و سرعت ملی اور خزاں کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل گیا۔

مطہری شہید نہ صرف ایک منفرد اہل قلم اور متعدد جلیل القدر علمی و دینی کتب کے مصنّف تھے بلکہ میدانِ خطابت کے بھی یکہ تازہ شہسوار تھے، اپنی بصیرت افروز اور ایمان افزا تقریروں سے انہوں نے ایرانی معاشرہ کے پیکرِ اخلاق و عمل میں تازہ روح پھونکی اور تعلیمات اسلامی سے برگشتہ اور آئین اسلامی سے سرکش نوجوان نسل کی اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف راہنمائی کی۔

استاد مرحوم کی شہادت کی چھٹی برسی کے موقع پر ہم اسلامیانِ پاکستان کی خدمت میں ان کے مختصر حالات زندگی پر مشتمل یہ کتابچہ اردو زبان میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کی اشاعت سے ہمارا مقصد آپ حضرات کو ان کی دینی خدمات سے روشناس کرانا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ ہماری یہ حقیر کوشش کامیاب ہوگی اور اس تحریر میں آپ اس عظیم شخصیت کے خد و خال پوری وضاحت سے دیکھ سکیں۔ واللہ ولی التوفیق

شعبہ نشر و اشاعت

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران،

کراچی

اُستاد شہید آیۃ اللہ مطہری کی شہادت پر

امام خمینی کا پیغامِ تعزیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں اسلام، علمائے اعلام اسلام، امتِ مسلمہ اور بالخصوص ایران کی مجاہد ملت کی خدمت میں فقیہہ عالی مقام فیلسوف علام اور مفکر حکیم اسلام جناب مرحوم آقائے شیخ مرتضیٰ مطہری شہید (قدس سرہٗ) کی اندوہناک رحلت پر دلی تعزیت عرض کرتا ہوں اور شہید کی روح کو اس فوزِ عظیم پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہوں۔

یہ تعزیت میں اس عظیم انسان کی شہادت پر پیش کر رہا ہوں جس نے اپنی پوری عمر عزیز اسلام کے مقدس اہداف کے حصول کی جد وجہد میں صرف کی اور جو بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف پوری سخت جانی سے نبرد آزما رہا۔

یہ تعزیت میں اس بطلِ عظیم کی جانکاہ شہادت پر پیش کر رہا ہوں جو دینِ اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحّر اور قرآن حکیم کے حقائق و غوامض کی بصیرت و معرفت میں اپنی مثال آپ تھا۔

میں اپنے عزیز ترین فرزند کے لئے سوگ نشیں ہوں جو میری عمر کا حاصل تھا۔

اس دانشمند علام کی شہادت سے عالمِ اسلام میں ایک بہت

بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے پُر کرنا فی الحال ممکن نہیں۔ ایسی فدا کار شخصیتوں کا وجود ہمارے لیے باعث عزّت وافتخار ہے جو زندگی میں بھی اور زندگی کے بعد بھی اپنے علم وعرفان کی نور پاشیوں اور ضیا باریوں سے دنیا کو روشن کر رہی ہیں۔ میں ایسے فرزند کی تربیت پر جس نے اپنی نورانی تبلیغات سے مردہ روحوں کو زندگی بخشی اور جہالت کی تاریکیوں کو اپنے علم کی شمع فروزاں سے منور کیا، آغوش اسلام کو سلام کہتا ہوں اور تہِ دل سے اسے مبارک باد پیش کرتا ہوں میں نے اگرچہ ایک ایسا فرزند کھویا ہے جو میرے بدن کا حصّہ تھا۔ لیکن یہ حقیقت میرے لئے سرمایہ صد افتخار وتشکر ہے کہ ہم میں زمانہ صدر اسلام کی طرح اب بھی مطہری شہید جیسے عظیم اور علی کردار افراد موجود ہیں۔

مطہری مرحوم جو رُوح کی طہارت وپاکیزگی، قوتِ ایمان اور شوکتِ بیان میں اپنی نظیر آپ تھے، ہم سے رخصت ہو کر اعلیٰ علیین میں رحمتِ حق تعالیٰ سے جا ملے ہیں۔ لیکن بدخواہوں کو خوب جان لینا چاہیے کہ ان کی رحلت کے بعد بھی ان کی اسلامی شخصیت اپنی پوری عظمتوں کے ساتھ زندہ ہے اور یہ دہشت گردیاں اور کشت وقتل ایسی شخصیتوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ ان شر ور شیطانی کے مدبّروں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ وتوانا کے فضل وکرم سے ہماری ملّت کا عزمِ صمیم ایسی عظیم شخصیتوں کو کھو کر فساد اور استبداد و استعمار کی بیخ کنی کے لئے مزید محکم واستوار ہو جاتا ہے۔ ہماری ملّت نے اپنی راہ پالی ہے اور اب وہ شاہ معدوم کی منحوس و مذموم حکومت کی جڑیں کاٹنے، اس کے گماشتگان کو نابود کرنے اور اس کے آثار کو محو کرنے کا کوئی موقع ضایع نہیں کرے گی۔ اسلام

کا دستور کار عصرِ وحی سے لے کر آج تک شہادت و شہامت پر قائم رہا ہے اور راہِ خدا اور حمایت مستضعفین میں جان دینا ہمیشہ سے اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَمَالَکُمْ لا تقاتلون فِی سبیل اللّٰہ وَالمستضعفین مِنَ الرجال و النساء والولدان"

باطل پرستوں نے اب نوشتۂ دیوار پڑھ لیا ہے اور وہ خوب سمجھ چکے ہیں کہ ان کی زندگی کے دن ایسے گِنے جا چکے ہیں۔ اب وہ جنونِ انتقام میں اندھے ہو کر غیر انسانی سلوک پر اُتر آئے ہیں اور اس طرح سے وہ اپنے زعمِ باطل میں مجاہدین اسلام کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے شہیدوں کے بدن کے ہر بال سے اور اس سے ٹپکنے والے مقدس خون کے ہر قطرے سے ایک پختہ عزم مجاہد پیدا ہوتا ہے۔

تم اس عظیم و بہادر قوم کے کتنے ہی سرفروشوں کو قتل کر ڈالو لیکن ہمارے بڑے سے بڑے مجاہد کے بہیمانہ قتل سے بھی تمہارے غارتگرانہ اہداف پورے نہ ہوں گے۔ یہ ملت جو خدائے بزرگ و برتر پر اعتماد کر کے احیائے اسلام کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے، تمہاری اس قسم کی نامردانہ مذبوحی کوششوں سے پسپا نہیں ہوگی۔ ہم راہِ خدا میں ہر قسم کی قربانی اور شہادت کے لئے آمادہ اور کمربستہ ہیں۔

میں جمعرات ۱۳ اردیبہشت ۵۸ کو اسلام کے اس شہید بطلِ حریت کی فداکار شخصیت کے احترام میں عام تعزیت کا اعلان کرتا ہوں اور

جمعرات اور جمعہ کے روز خود مدرسۂ فیضیہ میں شہید عزیز کے غم میں سوگ نشیں ہوں گا۔

اللہ تعالیٰ سے میں اسلام کے اس عظیم و عزیز فرزند کے لئے رحمت و مغفرت کا طالب ہوں اور اسلام عزیز کے لئے عظمت اور عزت و شوکت کی دعا کرتا ہوں۔

میرا سلام ہو حق و آزادی کی راہ کے شہداء پر۔

(روح اللہ الموسوی الخمینی)

استاد شہید آیۃ اللہ مطہری کی شہادت کی برسی پر

امامِ اُمّت کا پیغام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اگرچہ ایران کا اسلامی انقلاب بدخواہوں اور مفسدہ پردازوں کی مذموم کوششوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے کامیاب ہوا اور اسلام کی انقلابی اقدار یکے بعد دیگرے تقریباً ایک سال کی مدت میں ایک بار پھر پوری کامیابی سے اسلامی معاشرے میں رائج ہوگئیں۔ لیکن اس دوران میں ہماری ملت اور اسلام کے علمی مراکز کو اسلام دشمن منافقوں کے ہاتھوں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے جن میں سے ایک بہت بڑا نقصان دانشمند علامِ اسلام، مفکرِ اُمت حجت الاسلام جناب الحاج شیخ مرتضیٰ مطہری شہید کا خائنانہ قتل ہے۔ اس عظیم وعزیز شخصیت کے بارے میں اپنے دلی احساسات و عواطف کو بیان کرنے کے لئے میرے لئے پاس الفاظ نہیں۔ ان کے متعلق میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اسلام اور علم کی نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ بہت حسرت وافسوس کا مقام ہے کہ خیانت کار مجرموں نے علمی اور اسلامی مراکز کی مضبوط بنیاد کو ہلا ڈالا۔ گلشنِ علمِ دین کے سدا بہار پھلدار درخت کو اُکھیڑ دیا اور اس کے بیش قیمت ایمان افروز پھل سے اہلِ علم کو محروم کر دیا۔ مطہری میرے نہایت

عزیز فرزند، دینی علمی مراکز کی محکم و مضبوط بنیاد اور ملک و ملت کے بہت بڑے خادم تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انہیں اپنے دین کے عظیم ترین خدمت گزاروں کے ساتھ محشور فرمائے۔ اب سننے میں آرہا ہے کہ مخالفینِ اسلام اور انقلاب دشمن جماعتیں اس کوشش میں ہیں کہ اپنی زہریلی اور معاندِ اسلام تبلیغات سے ہمارے یونیورسٹی کے طلبہ کو استاد شہید کی تصنیفات کے مطالعے اور ان کے استفادے سے محروم کر دیں۔ پرعزم طلبہ اور روشن فکر نوجوانوں کو میری طرف سے ہدایت ہے کہ اس عظیم استاد کے آثار کو اسلام دشمن عناصر کی دسیسہ کاریوں سے متاثر ہو کر نظر انداز نہ کریں اور تلف و فراموشی کا شکار نہ بننے دیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام عزیز طلبہ کے لئے توفیق اور روشن مستقبل کی دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیٰ عباد اللہ الصالحین

(روح اللہ الموسوی الخمینی)

استاد شہید مطہری کے مختصر حالات زندگی

بچپن (۱۹۱۹ء - ۱۹۳۲ء)

استاد شہید آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہری ۲ فروری ۱۹۱۹ء (۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۸ھ) کو مشہد مقدس سے ۷۵ کیلو میٹر دور ایک گاؤں فریمان میں (جو اب شہر بن چکا ہے) ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ محمد حسین مطہری مرحوم بڑے متقی اور محترم انسان تھے۔ آداب اسلامی سے متصف، اخلاق اسلامی سے آراستہ اور تقویٰ و پرہیزگاری میں بے مثال تھے اور منہیات و معاصی سے اجتناب اور تزکیہ نفس میں بڑے درجات پر فائز تھے۔

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات!" ___ استاد شہید کی شخصیت میں بچپن ہی سے عظمت و بزرگی اور سعادت و بلند اقبالی کے آثار نمایاں تھے اور ان کی رفتار و کردار میں روشن اور درخشاں مستقبل کی جھلک تھی۔ تقویٰ و پاکیزگی کے جوہر نے والد کی صحبت سے خوب جلا پائی اور انہی کے فیض تربیت سے وہ روحانی اور اخلاقی بلندیوں کو پہنچے۔ اپنی کتاب "داستان راستان" کو انہوں نے اپنے والد بزرگوار کو ہدیہ کرتے وقت اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ ایمان و عمل صالح، تقویٰ و تزکیہ نفس اور راستی و استقامت کے سب ملکات عالیہ انہیں والد ہی کے حسن تربیت سے حاصل ہوئے ہیں۔

وہ بچپن ہی سے اپنے ساتھیوں سے مختلف تھے۔ پاکیزگی اور پرہیزگاری کو دوست رکھتے اور ناپسندیدہ امور سے گریز کرتے تھے ابھی تین ہی سال کے تھے کہ بعض اوقات کافی دیر تک قیام نماز میں کھڑے رہتے۔ ان کی ساری زندگی میں جو عوامل و عناصر واضح طور پر کارفرما نظر آتے ہیں اور جنہوں نے ان کی شخصیت سازی میں بڑا کردار انجام دیا، ایک تو وہی ایمان و تقویٰ و نیکوکاری کا وصف تھا جس پر وہ ساری عمر عمل پیرا رہے اور ہمیشہ اس کی مزید تقویت میں کوشاں رہے[1] اور دوسرا عامل اسلام کے ساتھ ان کی والہانہ محبت و وابستگی تھی جو پوری زندگی ان کی رگ و پے میں سرایت کئے رہی اور اس کی قوت و شدت میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہا اور وہ ان کی زندگی کے ہر دور اور ہر طور میں نت نئی تجلی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی۔

بچپن کی عمر گذرنے کے بعد ان کی مدرسی زندگی قرآن مجید کے درس سے شروع ہوئی۔ تعلیم کے ساتھ ان کی شیفتگی حیرت انگیز تھی۔ وہ بڑے شوق و رغبت اور پوری باقاعدگی سے مدرسے جاتے، کتاب اور درس سے انہیں گویا عشق تھا اور اپنے اساتذہ کے ساتھ والہانہ محبت کرتے اور ان کے احترام میں مبالغہ کرتے تھے۔ اس دور میں ان کی شخصیت

---

[1] ہر وہ اخلاقی قدر جسے استاد مطہری نے اپنایا وہ ان کی دوسری اقدار کے پہلو بہ پہلو پرورش پاتی اور آپ کی شخصیت میں جذب ہو کر اس میں نئے بُعد کا اضافہ کرتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ علم کی زیادتی سے آپ کے تقویٰ و طہارت نفس میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اور مختلف علوم مثلاً فلسفہ، فقہ، تفسیر وغیرہ میں آپ کے تبحر نے یکرخی اختیار نہ کی۔ علمی تحقیق ان کو ملت اسلامی کے مسائل سے غافل نہیں کر سکی۔ اور لوگوں کی عام صحبت اور ان کے ساتھ برابری کے سلوک سے وہ سطحی بین نہیں بنے۔

ہیں ایک واضح بُعدی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ بُعد علم ودانش کا ہے جس کی وسعت اور گہرائی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ساری عمر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کے آخری ایام میں علم کے بُعد کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور عشقِ اسلام کے دو بُعد متوازی طور پر ان کی شخصیت میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ دراصل ان جملہ عوامل کی ہم آہنگی ہی ان کی زندگی کی عظیم اور گرانقدر دینی و علمی خدمات کا باعث بنی۔

۲۔ حوزہ علمیہ مشہد میں (۱۹۳۲ - ۱۹۳۶)

بارہ سال کی عمر میں وہ حوزہ علمیہ مشہد میں داخل ہوجاتے ہیں اور علوم اسلامی کے مقدمات کی باقاعدہ تحصیل کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن اسی زمانے میں ان کی زندگی میں ایک ایسا ذہنی اور فکری انقلاب رونما ہوتا ہے جو ان کے جملہ افکار و خیالات کو شدید اضطراب سے دوچار کردیتا ہے: وہ ہستی باری تعالیٰ کے بارے میں تردد و تذبذب کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور ان کی عقل کی کشتی حیرت و اضطراب کے متلاطم سمندر میں ہچکولے کھانے لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود و عدم کا موضوع حسّاس ترین اور اضطراب انگیز ترین علمی موضوعات میں سے ہے جو فجر تاریخ سے لے کر آج تک ذہن انسانی پر مسلط ہے اور اسکے قوائے عقل و فکر کے لئے ایک عظیم چیلنج بنا ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس مسألہ کی اہمیت، اُس زمانے میں استاد مطہری کے اس ذہنی اضطراب کی کیفیت اور ان کی قلبی واردات کی داستان خود ان کی زبان سے سُنی جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ مسألہ نظامِ تخلیق میں انسان کے مقام، اس کے فکر و اندیشہ اور اس کی شخصیت کے تمام ابعاد، کائنات کے بارے میں اس کے نظریات اور امور زندگی کے متعلق اس کے اندازوں اور اقدار کے حوالے سے اس کے اخلاقی اور اجتماعی موقف کی تعیین میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی اندیشہ اس اندیشے سے زیادہ اضطراب آفریں ہو سکتا ہے۔ ہر وہ انسان جسے عقل و فکر سے ذرا سا بھی سروکار ہے، اپنی عمر کا ایک نہ ایک دور اس اضطراب اور ذہنی کرید میں ضرور گزارتا ہے۔

" اپنے ذہنی تذبذب و تردد اور قلبی کرب و اضطراب کے بارے میں جہاں تک مجھے یاد ہے، تیرہ سال کی عمر میں مجھ میں یہ کرید پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں ہستی خالق کے بارے میں مجھ میں ایک حساسیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور اپنی ذہنی سطح اور علمی مبلغ کے مطابق نوکیلے نوکیلے سوالات میرے ذہن پر ہجوم کئے رہتے تھے۔ قم کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں جبکہ ہنوز میں عربی زبان کے مقدمات سے بھی فارغ نہ ہوا تھا، میں انہی خیالات میں اتنا مستغرق رہتا تھا کہ مجھ میں "تنہائی" کا شدید میلان پیدا ہو گیا تھا۔ حتّیٰ کہ کمرے کے ساتھی کا وجود بھی میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اوپر کی منزل کے بہترین کمرے کو چھوڑ کر میں ایک قبر نما نصف کمرے میں منتقل ہو گیا تھا تاکہ میری تنہائی اور اندیشہ ہائے دور و دراز و لامتناہی میں کوئی مخل نہ ہو۔ اس زمانے میں درس و مباحثہ سے فارغ

اوقات کو میں کسی بھی اور موضوع میں صرف نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل کسی بھی اور موضوع میں غور و فکر کو میں، تاآنکہ ان مسائل میں میرے ذہنی عقدے نہ کھلیں، عبث اور ضیاع اوقات سمجھتا تھا۔ عربی زبان یا فقہی، اصولی اور منطقی مقدمات بھی میں محض اس لئے سیکھ رہا تھا کہ اس موضوع پر فلاسفہ کبار اور علماء اعلام کے افکار و آراء کے فہم و مطالعہ کے قابل ہو جاؤں۔"

یہیں سے مسائل کی اصلیت اور اصول کی حقیقت دریافت کرنے کے بارے میں ان کے نقاد ذہن کی معرفت تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ عربی زبان اور فقہی، اصولی یا منطقی مقدمات اگرچہ سب کے سب قطعی فوائد کے حامل ہیں لیکن ان کی حیثیت محض فروع کی ہے جن کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت تک متعین نہیں ہوتی جب تک ان کی اصل استوار نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد مطہری کی نظروں میں فلاسفہ اور عرفاء متکلمین کا مقام بہت بلند ہے۔ یہاں ایک اور اہم عامل ان کی شخصیت میں وارد ہوتا ہے جس کا ان کی علمی و فلسفی حیثیت کی تکوین میں یقیناً بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ عامل فلسفی، عرفانی اور کلامی فکر و استدلال سے ان کی وہی شیفتگی اور والہانہ قلبی وابستگی ہے جس کی وجہ سے وہ خود بھی آخرکار اس میدان کے یکہ تاز شہسوار بن جاتے ہیں۔ وہ خود اس بارے میں لکھتے ہیں:

"مجھے خوب یاد ہے کہ طالبعلمی کے اسی ابتدائی زمانے میں جب میں مشہد میں عربی زبان کے مقدمات پڑھ رہا تھا، فلاسفہ، عارفین اور متکلمین کو جن کے افکار سے میں واقف بھی نہ تھا، تمام علماء و دانشمند و محققین و مکتشفین سے

بلند تر اور عظیم تر سمجھتا تھا۔ اور صرف اسی دلیل پر کہ میری نظروں میں وہ عرصۂ فکر و اندیشہ کے عظیم شہسوار تھے، صرف تیرہ یا پندرہ سال ہی کی عمر میں حوزہ علمیہ مشہد کے ایک فاضل ترین اُستاد کا سراپا میرے قلب و نظر میں سما گیا۔ میں انہیں سب سے زیادہ عظیم و قابلِ احترام سمجھتا تھا اور ان کا چہرہ دیکھنا، ان کی مجلس میں بیٹھنا اور ان کی حرکات و سکنات اور ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرنا اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ کبھی ان کے درس میں شمولیت کا شرف حاصل کروں۔ یہ عظیم و محترم شخصیت آقای میرزا مہدی شہیدی رضوی کی تھی جو حوزہ میں فلسفہ الٰہیات کے استاد تھے۔ لیکن افسوس کہ میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی کیونکہ وہ اسی سال ۱۳۵۵ ہجری میں وفات پا گئے۔"

۳۔ حوزہ علمیہ قم میں (۱۹۳۷ء۔ ۱۹۵۲ء)

شہر مشہد کا قدیمی حوزہ ادب، فقہ، فلسفہ اور دوسرے اسلامی علوم میں اپنے اساتذہ کے تبحّر کے لحاظ سے دوسرے شہروں کے حوزہ جات سے بہت ممتاز اور اہم تھا۔ لیکن رضا خاں کی ظالمانہ حکومت کے جور و جبر اور ستم رانیوں نے علمائے روحانیین کو بہت بڑی سختی میں مبتلا کر دیا تھا جس کی وجہ سے یہ عظیم علمی مرکز خاتمے کے اندیشے سے دوچار تھا اور عنقریب بند ہوتا نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف قم کا نیا قائم شدہ حوزہ جو ۱۹۲۲ء میں مرحوم آیۃ اللہ العظمیٰ الحاج شیخ عبدالکریم حائری یزدی کے ہاتھوں قائم ہوا، قوم کی توجہات کا مرکز بن رہا تھا۔ اس نوخیز حوزہ کو

بھی اگرچہ کاری ضربیں پہنچی تھیں لیکن اپنے عظیم بانی کی لیاقت و قابلیت، ہمت و تحمل اور جد وجہد و مقاومت کی وجہ سے وہ تقریباً چار سو زیر تعلیم طلبہ کے ساتھ اپنے قدموں پر جاری رہا۔ لیکن یہ عالم آزردہ دل غم واندوہ اور حسرت و یاس کے عالم میں انہی پُر آشوب سالوں میں ۱۳۵۵ ہجری میں اس دنیا سے رخصت ہوا اور حوزہ کے ادارہ و انتظام کی ذمہ داری آیۃ اللہ العظمیٰ سید محمد حجت، آیۃ اللہ العظمیٰ سید صدرالدین صدر اور آیۃ العظمیٰ سید محمد تقی خوانساری کے سپرد ہوئی۔

اسی زمانے میں استاد مطہری علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لئے حوزہ علمیہ قُم کا رخ کرتے ہیں۔ انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے بڑی کوشش کی جاتی ہے اور علمائے روحانیین کی حالتِ زار اور ان پر گذرنے والے مصائب بھی، جن کو وہ خود بھی دیکھ چکے ہیں، ان کے گوش گذار کئے جاتے ہیں لیکن وہ اس سے کوئی اثر نہیں لیتے بلکہ ان کی آتش شوق کو مزید ہوا ملتی ہے۔ آخر کار سب کو ان کے ارادے کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور وہ ۱۹۳۷ء میں اٹھارہ سال کی عمر قُم میں آجاتے ہیں۔

قُم میں اُستاد مطہری کے ۱۵ سالہ قیام کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کرنا اور اسے زیر بحث لانا ضروری ہے۔ ہم اس بحث کو چند ابواب میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ ذہنی و روحانی خصوصیات:

قُم میں آمد کے ابتدائی زمانے میں بھی جیسا کہ ہم خود ان کی زبانی سُن چکے ہیں، ان کی ذہنی کرید اور روحانی اضطراب بدستور موجود ہے اور خدا شناسی کے بارے میں وہ اندیشہ و افکار کے ہجوم میں کھوئے رہتے ہیں۔

نیز اپنی گم شدہ شخصیت کی بازیابی کا بھی انہیں بڑا خیال ہے اور وہ کسی ایسی کامل شخصیت کی تلاش میں ہیں جو مرحوم آقائے میرزا مہدی شہیدی جیسی ہو۔ آخر کار، انہیں اپنا آیڈیل مل جاتا ہے جس کی ذات میں وہ اپنا گم شدہ نفس پا لیتے ہیں اور انہیں اپنی پیاسی روح کو اس محبوب شخصیت کے چشمۂ فیض سے سیراب کرنے کا حسب دلخواہ موقع مل جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

"قم آکر میں نے اپنی گم شدہ ذات کو ایک دوسری عظیم شخصیت میں پا لیا۔ میں اس محبوب و محترم شخصیت میں مرحوم آقائے میرزا مہدی شہیدی کی ذات کو کچھ اضافی خوبیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ دیکھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری تشنہ روح اس کے سرچشمۂ زلال سے ضرور سیراب ہوگی۔ اگرچہ قم کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں میں ابھی مقدمات سے بھی فارغ نہ ہوا تھا اور ابھی معقولات کے درس میں شمولیت کے لائق نہ تھا لیکن اپنی اس محبوب شخصیت کے ہر جمعرات اور جمعہ کو ہونے والے درس اخلاق سے جو خالص علمی رنگ میں دراصل معارف اور سیر و سلوک ہی کا درس تھا، میں سرمست ہو جاتا۔ اس کی تاثیر میں کھو جاتا اور ایسے وجد کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا جو بلا مبالغہ آئندہ منگل تک قائم رہتی۔ اس درس اور اس کے بعد کے بارہ سالہ درسوں نے جو میں نے اس عالم ربانی استاد سے حاصل کئے، میری روحانی اور فکری شخصیت کے بہت بڑے حصّے کی تعمیر کی۔ اس کے لئے میں نے اپنے علمی وجود کو ہمیشہ ان کا مرہون منت اور ممنون احسان سمجھا ہے

وہ یقیناً "روح قدسی الٰہی" تھے۔

اور وہ "روح قدسیٔ الٰہیؒ" یہی حضرت امام خمینی ہیں جن کی تربیت کا استاد شہید مطہری کی علمی و اخلاقی شخصیت کی تعمیر میں واقعی سب سے اہم کردار رہا ہے۔

استاد مطہری حوزہ علمیہ میں طالبعلمی کے زمانے میں ہمیشہ کی طرح بہت محنتی تھے اور اپنے سبق اور تحصول علم میں سخت کوش تھے۔ متقی اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ نماز تہجد پوری پابندی اور باقاعدگی سے ادا کرتے حتیٰ کہ اگر کبھی مہمان آجاتے تو چاہے کتنا ہی وقت انکی پذیرائی اور مہمان نوازی میں صرف ہو، اس نماز کو کبھی ترک نہیں کرتے تھے۔ قم میں ان کے رفیق حجرہ فقیہ عالی قدر حضرت آیۃ اللہ منتظری تھے جن کے ساتھ ان کا محبت و دوستی کا رشتہ پہلی ملاقات سے لیکر آخر دم تک روز افزوں استحکام کے ساتھ قائم رہا۔ دونوں پورے گیارہ سال تک ہم سبق اور رفیق بحث و تحقیق رہے۔ دونوں امام خمینی اور آیۃ اللہ بروجردی کے نور نظر شاگرد تھے۔ علاوہ ازیں دونوں ہی حوزہ کے مشہور و معروف اور مسلّم استاد بھی تھے۔

مدرسہ فیضیہ کے مشرقی حجروں کا بالائی حصہ جہاں استاد مطہری اور آیۃ اللہ منتظری مقیم تھے، عوام و خواص کی توجہ کا مرکز تھا اور علمائے اعلام فضلائے عظام اور اساتذہ کرام کے علاوہ انتہائی بلند علمی اور دینی شخصیتو بالخصوص حضرت امام خمینی کی اس مقدس حجرے میں آمد و رفت سب کی نظروں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں استاد مطہری کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے جو ان کی علمی اور روحانی شخصیت کی تعمیر میں بہت

مؤثر کردار کا حامل ہے۔ یہ واقعہ ادیب و محقق، حکیم و فقیہہ، طبیب بے مثال مرحوم و مغفور آقائے الحاج میرزا علی آقا شیرازی اصفہانی سے ان کا تعارف ہے جوان کے ہمدرس اور محبوب دوست آیۃ اللہ منتظری کی وساطت سے اصفہان میں ہوا۔ اس تعارف کی برکت سے ان کا تعارف نہج البلاغۃ کی دنیا سے ہوتا ہے۔ یہ تعارف ان کی زندگی کا بیش قیمت ترین اور عزیز ترین واقعہ ہے۔ آئیے اس واقعہ کی تفصیل انہی کی زبان سے سنیں:

" ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ کے موسم گرما میں میں قم سے اصفہان گیا اور وہاں پہلی بار اس محترم بزرگ سے متعارف ہوا اور ان کے حضور خدمت سے شرفیاب ہوا۔ یہ تعارف بعد میں میری طرف سے دلی ارادت و عقیدت اور ان کی طرف سے بزرگانہ محبت اور استادانہ شفقت میں تبدیل ہوگیا۔ پھر یہ تعلق اتنا بڑھا کہ آپ عموماً قم تشریف لاتے اور میرے حجرے میں قیام فرماتے اور حوزہ میں موجود اپنے عقیدت مند علمائے کرام سے وہیں ملاقات فرماتے۔

" ۱۹۴۱ء میں جب میں پہلی بار اصفہان گیا تو میرے ہم مباحثہ گرامی نے جو اہل اصفہان میں سے تھے اور پورے گیارہ سال ہم آپس میں ہم مباحثہ رہے تھے اور جو اب حوزہ علمیہ قم کے اساتذہ کبار اور مجتہدین عظام میں سے تھے، میرے سامنے تجویز پیش کی کہ مدرسہ صدر میں ایک بہت بڑے عالم نہج البلاغہ پڑھا رہے ہیں، آؤ ان کے درس میں چلیں۔ یہ تجویز میرے لئے بہت سخت تھی۔ کیونکہ جو طالبعلم کفایۃ الاصول پڑھ رہا ہو اسے نہج البلاغہ کے درس میں حاضری کی ضرورت نہیں اسے چاہئے کہ نہج البلاغہ کا خود مطالعہ کرے اور اس کی مشکلات کو اپنی لیاقت و قابلیت اور عقل و ذہانت سے اپنے ہمدرسوں کے ساتھ مل کر حل کرے۔

"لیکن چونکہ چھٹیوں کے دن تھے اور میں بے کار تھا اور پھر یہ تجویز میرے ہم مباحثہ کی طرف سے پیش ہوئی تھی، لہذا میں نے قبول کر لی۔

"وہاں جاکر مجھ پر اپنے ایک بہت بڑے اشتباہ کا انکشاف ہوا: مجھے معلوم ہوا کہ میں نہج البلاغۃ نہیں جانتا اور نہ صرف یہ کہ میں کسی استاد سے اُسے سیکھنے کا محتاج ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ نہج البلاغۃ کا کوئی لائق اور قابل بھی استاد موجود نہیں۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ایسے متقی عالم دین کے روبرو کھڑا ہوں جو ہم طلبہ کے بقول یقیناً ایسا ہے کہ (فینبغیٔ ان یشد الیہ الرحال) اس تک پہنچنے کے لئے رختِ سفر باندھا جائے اور اس کے فیض تدریس سے استفادہ کیا جائے۔"

اُستاد مطہری کی آقائے شیرازی اصفہانی سے شناسائی دو طرح سے ان پر اثر انداز ہوئی:

۱۔ ذہنی و فکری کشش کے اعتبار سے۔

۲۔ نہج البلاغہ سے واقفیت کے اعتبار سے۔

۱۹۴۱ء کا سال استاد مطہری کی زندگی میں بہت اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم ان حساس عوامل کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، جنہوں نے ان کی ذہنی، فکری اور روحانی شخصیت سازی میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ یہ حساس عوامل حسب ذیل تھے:

۱۔ دینی علوم کے حصول کے لئے ان کی گہری اور والہانہ شیفتگی

جس نے آخر کار انہیں قم پہنچایا۔

۲۔ وجود خالق کائنات کے بارے میں ذہنی کرید اور روحانی اضطراب۔

۳۔ فلاسفہ وعارفین بالخصوص آقائے مہدی شہیدی کی روحانی کشش سے گہری اثر پذیری۔

۴۔ امام خمینی جیسی عظیم شخصیت سے آشنائی اور ان کے درسِ اخلاق میں شرکت۔

اب بڑی آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرحوم الحاج میرزا علی آقا شیرازی جیسے شخص کے ساتھ استاد مطہری کی آشنائی ان کے لئے کس قدر اہم اور قیمتی رہی ہوگی۔ وہ اس عالم ربانی سے اس قدر متاثر تھے کہ ناممکن تھا کہ ان کا نام لیا جائے اور یہ ان کی مدح وتوصیف میں رطب اللسان نہ ہوجائیں۔ استاد مطہری اس عالم ربانی کے عاشق دل باختہ تھے اور ان کی بہت سی اخلاقی اور روحانی صفات سے انہوں نے خود کو متصف کرلیا تھا۔ اس عظیم عالم ربانی کا وصف خود استاد شہید کی زبانی سنئے:

"بڑا ظلم ہوگا اور بہت افسوس کی بات ہوگی کہ اس مقدمہ میں اس عظیم انسان کا ذکر خیر نہ کروں جس نے مجھے زندگی میں پہلی بار نہج البلاغہ سے متعارف کرایا اور جس کے درس میں حاضری کو میں اپنی زندگی کی ایسی متاع گراں بہا سمجھتا ہوں جس کا میں کسی بھی عزیز وبیش قیمت چیز سے موازنہ نہیں کرسکتا۔ اور کسی بھی شب وروز میں اس کے ذکر اور تصور سے غافل نہیں ہوتا۔

"میں یہ تو پورے وثوق اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک

حقیقی عالم ربانی تھے لیکن یہ اعتماد سے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ میں بھی ان کا ایک کامیاب شاگرد تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب بھی کبھی میرا ان سے سامنا ہوتا تو میرے ذہن میں شیخ سعدی شیرازی کا یہ شعر آتا تھا۔

؎ عابد و زاہد و صوفی ہمہ طفلان اند　　مرد اگر ہست بجز عالم ربانی نیست
(عابد و زاہد و صوفی تو ہیں طفل مکتب　　مرد اگر ہے تو فقط عالم ربانی ہے)

"وہ فقیہ بھی تھے، حکیم بھی تھے، ادیب بھی تھے، طبیب بھی تھے اور فقہ، فلسفہ، عربی و فارسی ادب اور طب مشرق پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے اور ان موضوعات میں سے بیشتر میں درجہ اوّل کے متخصص شمار شمار ہوتے تھے۔ قانون بوعلی سینا کو کہ جس کے لئے آج استاد نایاب ہے کمال خوش اسلوبی اور مہارتِ تامہ کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ اور بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کے حوزۂ درس میں حاضر ہوتے تھے۔ انہیں کبھی بھی کسی خاص مضمون کی تدریس میں محدود و مقید نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ محدودیت کسی بھی شکل میں ان کی روح کے لئے سازگار ہی تھی۔ نہج البلاغہ واحد کتاب تھی جس کی تدریس کے ساتھ انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ نہج البلاغہ ان پر خاص کیفیت طاری کرتی تھی اور اپنے پروں پر بٹھا کر انہیں ایسی دنیاؤں میں لئے پھرتی کہ ہمارے لئے ان کا تصور بھی ممکن نہیں۔

"نہج البلاغہ ان کی زندگی اور خونِ رگِ حیات تھی۔ اسی سے وہ زندہ تھے اور اسی کی فضاؤں میں وہ سانس لیتے تھے۔ یہی کتاب انکی روحانی مونس و ہمدم تھی، اسی سے ان کی نبضیں متحرک تھیں اور اسی کے ساتھ ان کا دل دھڑکتا تھا۔ اس کے جملے کے جملے ان کے نوکِ زبان تھے جن سے وہ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استشہاد کرتے۔ ان کی زبان

پر نہج البلاغہ کی فصیح و بلیغ عبارتوں کی روانی اس کے نورانی و روحانی محاسن کی عقیدت میں ان کی آنکھوں سے اشکوں کی روانی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ۔

" ادیب محقق، حکیم ربانی، فقیہہ عالم مقام، طبیب مسیحا نفس، عالم خدا رسیدہ جناب مرحوم و مغفور آقائے الحاج میرزا علی آقا شیرازی اصفہانی قدس سرہ واقعی مرد حق و حقیقت تھے جو ذات و شخصیت کے سب بندھنوں سے آزاد ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے ہو گئے تھے ـــــ اپنے عظیم علمی مقام اور قد آور اجتماعی شخصیت کے باوجود حضرت ابی عبد اللہ الحسین علیہ السلام کے ساتھ والہانہ اور سوزاں عشق اور معاشرے کی ہدایت و ارشاد کے فرائض کا شدید احساس انہیں منبر پر لے گیا تھا۔ وہ وعظ کرتے اور ان کی پند و موعظت جو ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی سیدھی سامعین کے دلوں پر جا کر لگتی تھی۔ جب بھی کبھی وہ قم آتے اول درجہ کے علماء با صرار ان سے منبر پر جانے اور وعظ فرمانے کی گذارش کرتے۔ منبر رسول ان کے لئے "خطاب گاہ" سے زیادہ وجد و کیفیت کی منزل اور انوار معرفت کی شعاع گاہ تھا۔ ان کا وعظ محض خطاب نہیں تھا بلکہ قلب و روح کی تنویر کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔

" جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اصفہان کے سب لوگ انہیں پہچانتے تھے اور ان سے ویسی ہی دلی ارادت و عقیدت رکھتے تھے جیسی حوزہ علمیہ قم کے لوگوں کو ان سے تھی۔ قم میں ان کے ورود پر علمائے قم بڑے اشتیاق سے ان کی زیارت کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرتے لیکن وہ دوسری قیود کی طرح "مریدی" اور "مرادی" کی پابندیوں سے بھی آزاد تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر وسیع اور لا متناہی رحمتیں ہوں اور وہ انہیں اپنے بندگان خاص کے ساتھ محشور فرمائے۔

"لیکن اس سب کچھ کے باوجود میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ نہج البلاغہ کے تمام پہلوؤں پر کامل عبور رکھتے تھے، اس کی وسیع دنیا کے چپے چپے سے واقف تھے یا اس بحر زخّار و ناپیداکنار کے ہر مقام کی گہرائی کی انہوں نے پیمائش کی تھی، اور اس کے تمام مضامین پر انہیں پوری پوری دسترس حاصل تھی، لیکن نہج البلاغہ کے جن حصوں پر انہیں پورا تسلط و اختصاص حاصل تھا۔ ان کے مفاہیم و مقتضیات کے مطابق انہوں نے اپنے سراپا کو ڈھال لیا تھا اور اپنی حرکات و سکنات کو ان سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔

"نہج البلاغہ کی بہت سی دنیائیں ہیں: زہد و تقویٰ کی دنیا، عبادت و عرفان کی دنیا، حکمت و فلسفہ کی دنیا، پند و موعظت کی دنیا، کشت و خونریزی اور تلف و اعدام کی دنیا، سیاست اور اجتماعی فرائض کی دنیا، بہادری اور دلیری کی دنیا۔ یہ سب دنیائیں فرد واحد میں مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ اس بحر بیکراں کے کچھ حصّے کے کامیاب اور عمق پیما شناور تھے..."

اگر ہم استاد شہید کی ان عبارات میں جو انہوں نے الحاج میرزا علی آقا شیرازی کی مدح و ثنا میں کہی ہیں، غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ان میں بیشتر توصیفات خود ان کی ذات پر بھی صادق آتی ہیں۔ ان شاء اللہ ہم کوشش کریں گے کہ استاد مطہری کی فکری اور روحانی شخصیت میں ان سب پہلوؤں کی نشان دہی کر سکیں۔

استاد مطہری شہید الحاج میرزا علی آقا شیرازی کی طرح نہج البلاغہ اور اس کے خالق امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ساتھ والہانہ عشق رکھتے تھے۔ وہ اس کے کثیر الابعاد ہونے پر پوری طرح مطلع ہو چکے تھے اور اپنے نوجوان شاگردوں کو اسے صرف ایک زاویہ نظر سے دیکھنے سے

خبردار کرتے تھے۔ ان کی تصنیف "سیری در نہج البلاغہ" اس کارِ عظیم کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے جسے وہ نہج البلاغہ کے بارے میں انجام دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ لیکن اس کی مکمل صورت میں بھی وہ اسے نہج البلاغہ کے بارے میں ایک تفصیلی تحلیلی جائزہ نہیں سمجھتے تھے۔ اور اسی سبب سے انہوں نے اس کے لئے "سیری در نہج البلاغہ" (نہج البلاغہ پہ ایک نظر) کا نام تجویز کیا۔

۲۔ تحصیل و تدریس کی کیفیت:

علوم دینیہ کے حوزہ جات میں جو ایک مستحسن روش رائج ہے یہ ہے کہ تحصیل و تدریس بلا تردد ایک دوسرے کے دوران ہی میں شروع کر دی جاتی ہے اور معمولاً ایک طالبعلم اپنی تحصیلی مصروفیات کے دوران اپنے پڑھے ہوئے اسباق نچلی کلاسوں کو پڑھاتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنی بحث کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(الف) تحصیل کی کیفیت:

استاد مطہری ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء تک ادبیات، منطق، فقہ و اصول کے درمیانی اور اعلیٰ درجات کی تحصیل میں اور ازاں بعد بنیادی، تحقیقی اور عقلی علوم کی باضابطہ تحصیل میں مصروف رہے۔ اس دوران میں ان کے اہم اساتذہ حضرت امام خمینی، آیۃ اللہ العظمیٰ بروجردی اور علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ تھے۔ ہم فرداً فرداً ان کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی دامت برکاتہ:

استاد مطہری کو پورے ۱۲ سال اس استاد ربانی سے شرف تلمذ حاصل رہا اور ذہنی اور روحانی اعتبار سے انہوں نے ان سے بہت کسب فیض کیا۔ درس اخلاق کے علاوہ فلسفۂ ملاصدرا اور عرفان کا درس بھی انہوں نے

آپ ہی سے لیا۔

اس زمانے میں منظومہ حاجی سبزواری کا درس جوکہ معمولاً فلسفہ کی سب سے پہلی درسی کتاب ہے، حضرت امام خمینی اور حوزہ علمیہ قم کے فلسفہ کے قابل ترین استاد شیخ مہدی مازندرانی مرحوم دیا کرتے تھے اور ظن غالب یہ ہے کہ استاد مطہری بھی جو امام کے ساتھ مضبوط قلبی تعلق رکھتے تھے اور بارہ سال متواتر آپ سے استفاضہ کرتے رہے، منظومہ مذکورہ کے درس میں بھی ضرور شریک رہے ہوں گے۔

علاوہ ازیں استاد مطہری حضرت آیۃ اللہ منتظری، الحاج آقا رضا صدر، الحاج شیخ مہدی حائری یزدی (فرزند الحاج شیخ عبدالکریم حائری) اور چند دوسرے علماء و فضلاء کے ہمراہ ملاصدرا کی تصنیفات خصوصی طور پر امام کے سامنے پڑھتے تھے. گویا یہ درس قم میں آقائے مطہری کے قیام کے آخری سال تک جاری رہا اور اس کے بعد ختم ہوگیا۔ حضرت امام خمینی کے پاس بھی اس کے علاوہ فلسفہ کی کلاس موجود نہ تھی۔ مرحوم استاد مطہری اس درس اور دوسرے سب دروس پر آیۃ اللہ منتظری کے ساتھ مباحثہ کرتے تھے۔

استاد مطہری نے چند سال امام خمینی کے درس خارج کی اصول کی کلاسوں میں بھی جو ان کی اور آقائے منتظری کی درخواست پر جاری کی گئی تھیں، حاضری دی، یہ درس حضرت امام خمینی کے درس خارج کی اصول کی کلاسوں کا پہلا دورہ تھا جس میں آقائے مطہری اور جناب منتظری کے علاوہ تقریباً دس اور فضلاء شریک تھے۔

یہ درس خیابان حرم میں واقع کوچہ حرم کی مسجد میں پوری باقاعدگی کے ساتھ غروب سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے شروع ہوتا تھا اور ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ختم ہوجاتا تھا جس کے بعد امام خمینی خود اپنے سب شاگردوں

کے ساتھ جلوس کی شکل میں "مدرسہ فیضیہ" یا "مسجد عشق علی" میں جاکر حضرت آیۃ اللہ برجردی کے درس اصول میں شرکت کرتے تھے اور علمی تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آپ آیۃ اللہ بروجردی کی زندگی کے آخری دن تک ان کے اس درس میں شریک رہے باوجود اس کے کہ خود چار پانچ سو طلبہ پر مشتمل حوزہ علمیہ میں فقہ و اصول کے مدرس اعلیٰ تھے اور آپ کا درس سارے حوزہ میں پر رونق ترین درس تھا جس میں ذہین و قابل ترین اور روشن فکر نوجوان طلبہ کشاں کشاں جمع ہو گئے تھے۔

یہ درس تقریباً ۱۹۵۱ء میں ختم ہوا جس کے بعد امام خمینی نے درس اصول کے دو دورے تعلیم کئے۔

استاد مطہری اور حضرت آیۃ اللہ منتظری دونوں باوفا دوست امام خمینی کے خاص اور ممتاز شاگردوں میں سے تھے اور ان کا یہ تعلق ساری عمر اور ہر محاذ پر قائم اور روزافزوں رہا۔ دونوں دوست مدتوں ایک دوسرے کے ہم درس اور ہم مباحثہ رہے۔ مدرسی تعلیم سے فراغت کے بعد بھی دونوں ایک دوسرے کی رفاقت میں ہر قسم کے حالات کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ حضرت امام خمینی کی سب سے زیادہ انہیں دونوں پر نظر خاص تھی اور امام کی غیر حاضری میں دونوں نے ہمیشہ رہبری و ارشاد کے فرائض بطور احسن انجام دیئے۔

۲۔ مرحوم آیۃ اللہ بروجردی قدس سرہٗ:

آپ بروجرد میں اپنے قیام کے زمانے ہی سے علوم اسلامی میں جامعیت اور اجتماعی و سیاسی مسائل میں بصیرت کی وجہ سے دوسرے علماء سے ممتاز تھے۔ امام خمینی اور بعض دوسرے اساتذہ کے تقاضے پر قم آ گئے اور اپنے علمی تبحر اور عظیم استادانہ صلاحیت و مہارت سے حوزہ

علمیہ قم میں تازہ روح پھونکی۔ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں قم مہاجرت فرمائی۔

استاد مطہری حضرت آیۃ اللہ بروجردی کے قم میں آنے سے پہلے بھی ان کی زیارت کے لئے بروجرد جاتے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ لہٰذا قم میں بھی ان کے درس فقہ و اصول میں بھی شریک ہوئے۔ استاد منتظری اور استاد مطہری دونوں آیۃ اللہ بروجردی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ آیۃ اللہ بروجردی فقہ و اصول میں آقائے مطہری کے اہم ترین استاد شمار ہوتے ہیں۔

۳۔ استاد معظم علامہ سید محمد حسین طباطبائی دامت برکاتہ

علامہ طباطبائی نے ۱۹۴۶ء میں اپنے مولد تبریز سے قم کی طرف مہاجرت کی۔ حوزہ علمیہ قم میں جلد ہی ان کا علمی مقام بالخصوص فلسفہ و تفسیر میں سب پر روشن ہوگیا۔ استاد مطہری نے بھی ۱۹۵۰ء میں ان کے درس الہیات شفاء میں جو خصوصی طور پر تشکیل دیا تھا، شرکت اختیار کی۔ اس درس میں ان کے علاوہ آیۃ اللہ منتظری، ڈاکٹر بہشتی اور چند اور علماء بھی شریک تھے۔

استاد علامہ طباطبائی کے پاس درس شفاء کے علاوہ ایک اور خصوصی درس بھی تھا جو ہر ہفتہ جمعرات کی شب کو ہوتا تھا۔ یہی درس بعد میں ان کی کتاب "اصول فلسفہ و روش ریالسم" کی شکل میں ظاہر ہوا جو استاد مطہری کے مقدمہ اور مفصل توضیحی فٹ نوٹس کے ساتھ چھپی۔ اس درس کے شرکاء، دیگر علماء کو چھوڑ کر جن میں امام موسیٰ صدر بھی شامل تھے، زیادہ تر وہی تھے جو درس شفاء میں شرکت کرتے تھے۔

استاد علامہ طباطبائی کے پاس اس کے علاوہ دو عمومی درس بھی تھے جن میں ایک درس اسفار تھا اور دوسرا درس تفسیر قرآن (جو بعد میں "تفسیر المیزان" میں شکل میں شائع ہوا) ان میں سے ہر درس میں سو سے زیادہ طالبعلم تھے لیکن ان میں استاد مطہری اور دوسرے مذکورہ بالا حضرات شامل نہیں تھے۔

۴۔ مرحوم میرزا مہدی آشتیانی: استاد مطہری نے تقریباً ایک سال تک اس عظیم اور بزرگوار فیلسوف کے محضر سے استفادہ کیا۔

۵۔ مرحوم آیۃ اللہ سیّد محمد حجت: ان کے درس اصول سے استاد مطہری نے کچھ مدت استفادہ کیا۔

۶۔ مرحوم آیۃ اللہ سید محمد محقق داماد: ان کے درس فقہ میں انہوں نے کچھ مدّت حاضری دی۔

۷۔ مرحوم الحاج میرزا علی آقا شیرازی

مذکورہ بالا اساتذہ کے علاوہ انہوں نے آیۃ اللہ مرحوم سید محمد تقی خوانساری، آیۃ اللہ آقائے سید احمد خوانساری، آیۃ اللہ سید محمد رضا گلپایگانی اور آیۃ اللہ سید صدرالدین صدر کے درسوں سے بھی استفادہ کیا۔

(ب) تدریس کی کیفیت:

حوزہ علمیہ قم میں قیام کے دوران استاد مطہری خود بھی حوزہ کے معروف استاد رہے ہیں اور مختلف مضامین تعلیم کرتے رہے ہیں جن میں ادبیات میں مطول، منطق میں شرح مطالع، علم الکلام میں شرح تجرید، علم اصول میں وسائل اور کفایہ، فقہ میں مکاسب اور فلسفے میں شرح منظومہ شامل ہیں۔

۳۔ مادیین کی کتابوں سے تعارف:

آقائے مطہری اس دوران میں جن حالات سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر عمر بھر ان سے دوچار رہتے ہیں ان میں سے ایک مادیین کے لٹریچر سے ان کا تعارف ہے۔ انہوں نے پہلے پہل ۱۹۵۱ء میں مادیین کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور چونکہ فلسفے سے انہیں بہت زیادہ قلبی لگاؤ تھا اور اس موضوع پر وہ علمی دنیا میں اپنی لیاقت اور قابلیت کا لوہا منوا چکے تھے لہٰذا ان کتابوں

کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ یہ مطالعہ ان کے لئے بہت مفید رہا کیونکہ کیونکہ اس کی وجہ سے مادی اور الٰہی فلسفے کے مطالعے میں ان کی رغبت اور دلچسپی ساری عمر قائم رہی۔ ان کی آتشِ فکر کو مزید ہوا ملی اور میدانِ تحقیق میں ان کے سمندِ ذوق کی جولانیاں زور پکڑ گئیں اور طویل جد و جہد کے بعد آخر کار وہ فلسفہ الٰہیات اور فلسفۂ مادیات کے درمیان حدِ فاصل دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے اور حیات و کائنات کے بارے میں الٰہیاتی فلسفی نظریات اور مادیاتی فلسفی نظریات کا موازنہ کر کے پورے یقین و اعتماد سے اس فیصلہ پر پہونچے کہ اسلامی نظریۂ حیات کا مادی اندیشوں کی یلغار کے مقابلے میں بہر حال دفاع کرنا چاہئے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قم میں اُن کے قیام کے آخری سال اور تہران میں مہاجرت کے ابتدائی چند سال زیادہ تر اسی موضوع کے مطالعے میں صرف ہوئے اور اس دوران میں وہ مادی فلسفے کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے اور ان کی تلخیص میں مشغول رہے

۴۔ اسلامی معاشرے کی مشکلات سے واقفیت اور سیاسی و اجتماعی مجاہدات:

حوزہ علمیہ قم میں طالبعلمی کے دوران استاد مطہری کی زندگی میں ایک نئے اور بہت اہم باب کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ اسلامی معاشرے کی مشکلات اور اس کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں سے واقفیت ہے۔ استاد مطہری، جیسے روشن ذہن انسان کے لئے جو غور و فکر اور تدبر و تامل سے ہر قسم کے مشکل مسائل کے حل کی راہیں تلاش کر سکتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسلام اور اسلامی معاشرے سے والہانہ شیفتگی رکھنے کی وجہ سے ہر اس چیز کا تعاقب بھی کرتا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی تقدیر سے متعلق ہو، مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی مشکلات سے غافل رہنا کسی بھی صورت ممکن نہ تھا۔

مطہری شہید حوزہ علمیہ مشہد میں طالبعلمی کے زمانے ہی سے علمی

حوزہ جات پر رضا خان کی حکومت کے ظالمانہ دباؤ کو محسوس کر رہے تھے۔ جب انہوں نے حوزہ علمیہ قم میں مہاجرت کی تو اس وقت حوزہ کا انتظام وانصرام آیۃ اللہ سید محمد حجت، سید صدرالدین صدر اور سید محمد تقی خوانساری کے ذمے تھا۔

ان تینوں میں سے ہر ایک خاص خوبیوں اور خصوصیات کا حامل تھا۔ اور فاضل طلبہ ان تینوں مراجع عظام اور ان کی خوش انتظامی کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ استاد مطہری مرحوم بھی جو ایک روشن دماغ اور عالی فکر عالم تھے، ہر واقعہ اور ہر امر کی جزئیات پر نظر رکھتے تھے۔ اور اس پر غور و فکر میں مبالغہ کرتے تھے۔" ان تینوں حضرات کی سیرت اور علو مقام کے دقیق مطالعے سے اپنے تجربے میں اضافہ کرتے اور مشکلات کے حل کی راہیں ڈھونڈھتے تھے۔

دوسری طرف وہ امام خمینی جیسی شخصیت کے درس میں زیر تربیت تھے جو نہ صرف اپنے شاگردوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات کی تجلی سے فکر و نظر کو روشن کرنے اور اسلامی معاشرے کی اوضاع کی اصلاح کی تاکید کرتے تھے بلکہ عوامی ذہن کو بھی اسلامی معاشرے کی مشکلات سے روشناس کر کے انہیں اس کے حل کی کوشش کی طرف متوجہ کرنے کی تدابیر پر عمل پیرا تھے۔

حوزہ علمیہ قم کو فکر کی پختگی اور سیاسی شعور کے بلوغ کے لحاظ سے دوسرے علمی حوزہ جات پر برتری حاصل تھی۔ خصوصاً ۱۹۴۸، ۴۹ اور ۵۰ء کے سالوں کے دوران جبکہ حصول آزادی کی تحریک سارے ایران میں عروج پر تھی۔ قم میں بھی یہ تحریک زوروں پر تھی۔ خاص طور پر فدائیان اسلام نے جن کی مسلح بغاوت ڈاکٹر مصدق کو میدان میں لائی، اپنی کارروائیوں کا ہیڈ کوارٹر مدرسہ فیضیہ کو بنایا ہوا تھا اور شب و روز نماز جماعت کے بعد آیۃ اللہ سید محمد تقی خوانساری جو تحریک کے حامی تھے۔ طاغوتی حکومت

کے گھناؤنے عزائم کو بے نقاب کرتے اور اس کے خلاف قیام کی تلقین کرتے تھے۔

استاد مطہری خود ان کارروائیوں کے روح رواں افراد میں سے تھے اور اسلامی معاشرے کی اصلاح کی علمبردار سب جماعتوں بالخصوص فدائیان اسلام کے ساتھ منسلک تھے اور پوشیدہ طور پر ان کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

استاد مطہری سیاسی اور اجتماعی طور پر ذہنوں کی تنویر و تعلیم اور معاشرے کی اصلاح احوال میں دوسرے مدرسین سے بہت ممتاز تھے۔ درس کی کلاس میں، طلبہ کے فارغ اوقات میں، نجی ملاقاتوں کے دوران، ایام تعطیل میں، استاد کی خدمت میں باریابی کے انتظار کے دوران مدرسہ فیضیہ یا حوزہ قم کے صحن میں بلکہ جہاں کہیں بھی ممکن ہوتا، تنویر اذہان اور تعلیم و ہدایت کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اہل علم کا جہاں کہیں بھی کوئی اجتماع ہوتا اگر مطہری اس میں موجود ہوتے تو اکثر و بیشتر زبانِ حل وہی ہوتے ــــــ ان کی باتیں منطقی اور سنجیدہ ہوتیں اور ان کا انداز بہت اثر آفریں ہوتا۔ لہٰذا جوان اور روشن فکر طلبہ رفتہ رفتہ ان کی طرف کھنچنے لگے اور نہ صرف ان کے درس میں شامل ہوگئے بلکہ اجتماعی مسائل میں بھی ان کی راہنمائی سے فیض یاب ہونے لگے۔ یہ لوگ استاد مطہری کو ایک مدرس سے بہت زیادہ بلند و بالاتر سمجھتے تھے ــــــ مرکز اور اردگرد کے شہروں کے بیشتر فعال علمائے دین جو اسلامی انقلاب کی روح رواں رہے ہیں اور آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ استاد مطہری کے شاگردوں کی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۹۴۶ء کا سال استاد مطہری کی زندگی میں بہت اہم موڑ شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے ان کا دقیقہ رس ذہن پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بنیادی مسائل کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی پسماندگی کے عوامل میں غور کرنے لگتے ہیں۔ علمی حوزہ جات اور دیگر دینی تعلیمی اداروں کی مشکلات کے بارے میں سوچنا شروع کرتے ہیں۔ اسلامی علوم کی حقیقت سے مسلمانوں کی دوری کے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری متعدد مشکلات کے علاوہ اپنے ماضی اور طے کی ہوئی اپنی راہِ زندگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنی کتاب "عدل الٰہی" میں یوں رقمطراز ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ جب میں قم میں زیرِ تعلیم تھا تو ایک روز اپنی ذات، اپنے تحصیلی مراحل و منازل اور اپنے لئے معین کردہ تعلیمی پروگرام اور تدریسی نصاب کے انتخاب کے نتیجے پر غور کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس نصاب تعلیم کی بجائے میں نے جدید علوم کی تحصیل کا فیصلہ کیا ہوتا تو بہتر ہوتا یا نہیں؟ قدرتی طور پر اپنی ذہنیت، تدین اور روحانی علوم کی اس قدر و قیمت کے پیش نظر جو میرے نزدیک تھی، سب سے پہلے جو چیز میرے ذہن آئی یہ سوال تھا کہ پھر اس صورت میں میری روحانی اور اخلاقی افتادِ طبع کا کیا ہوتا؟! میں نے سوچا کہ اب میں اصول دین۔ توحید، نبوت، معاد، امامت پر پختہ ایمان رکھتا ہوں اور غیر معمولی طور پر انہیں عزیز رکھتا اور ان کے ساتھ دلی ارادت و عقیدت رکھتا ہوں۔ تو اگر میں نے ان کی بجائے علوم طبیعی یا ریاضی وغیرہ کی تحصیل کی راہ اختیار کی ہوتی تو میری ذہنی کیفیت کیا ہوتی؟

"پھر میں نے خود ہی جواب دیا کہ ان اصول پر ایمان بلکہ خود حقیقی عالم دین ہونا صرف اسی چیز پر منحصر نہیں ہے کہ انسان قدیم علوم کی باضابطہ

تعلیم حاصل کرے کیونکہ بہت سے لوگ ان علوم سے محروم ہیں اور طبیعی علوم میں اختصاص رکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ طاقتور اور راسخ ایمان کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ عملی طور پہ پورے پرہیز گار و متقی ہیں اور بعض اوقات مبلغ اسلام بھی ہیں اور علوم اسلامی کے واقف بھی۔ چنانچہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ میں بھی ان میں سے کسی علم کے دامن میں اپنے ایمان کو تلاش کر لیتا اور وہ ایمان میرے اس موجودہ ایمان سے بہتر ہوتا۔

" اس زمانے میں میں نیا نیا اسلامی حکمت الٰہی سے متعارف ہوا تھا، اور اسے ایک ایسے استاد[1] سے سیکھ رہا تھا جو دینی علوم کی معرفت کے مدعی اساتذہ کی اکثریت کے برعکس محض ایک سلسلۂ محفوظات ہی نہیں تھا بلکہ اس نے اسلامی الٰہیاتی فلسفے کو عملی طور پہ چکھا بھی تھا، میں اس کے عمیق ترین افکار و تصورات اور حقائق و معارف کا پورا ادراک حاصل کر چکا تھا، اور انتہائی شیریں بیانی اور موثر انداز سے انہیں بیان بھی کرسکتا تھا۔ ان دنوں کی روحانی اور ذہنی لذت اور بالخصوص استاد محترم کے عمیق و لطیف اور شیریں و روح پرور بیانات میری زندگی کی ناقابل فراموش یادوں میں سے ہیں۔

" ان دنوں میں میں اس مسئلہ کے ساتھ جسے میں نے ان ایام میں پورے مقدمات کے ساتھ سیکھا تھا، پوری طرح متعارف ہو چکا تھا اور معروف قاعدہ کہ: " الواحد لایصدر منہ الّا الواحد" (ذات واحد سے صرف امر واحد ہی سرزد ہو سکتا ہے) کو اس طرح سے پا چکا تھا جیسے

---

[1] قرائن اور مذکورہ اوصاف سے پتہ چلتا ہے کہ یہ استاد امام خمینی کے علاوہ کوئی دوسرے نہ تھے۔

کہ (کم از کم میرے اپنے خیال کے مطابق) ایک حکیم پاتا ہے۔ کائنات کے تغیر ناپذیر اور غیر متغیر نظام کو میں عقل کی آنکھ سے دیکھ چکا تھا اور سوچتا تھا کہ کس طرح میرے جملہ سوالات اور حقیقت واقعیہ کے بارے میں میرے تمام "چون و چرا" نقش برآب ہو گئے۔ کس طرح میں سمجھتا ہوں کہ موجودات کو ایک قطعی نظام میں منسلک قرار دینے والے قانون اور "لا مؤثر فی الوجود الا اللہ (کائناتِ وجود میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی کارفرما نہیں)" کے اصول کے درمیان کوئی منافات نہیں اور کیسے میں ان دونوں کو یکجا کر سکتا ہوں۔ یعنی میں اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ "الفعل فعل اللہ وھو فعلنا (ہر فعل اگرچہ ہمارا فعل ہے لیکن درحقیقت اس کا فاعل خدا ہے۔) اور اس جملے کے دونوں حصوں میں کوئی تناقض نہیں پاتا تھا۔ اور اگر ان کا باہمی تعلق مجھ پر واضح ہو چکا تھا تو یہ (علت و معلول کے ارتباط اور "الواحد لا یصدر منہ الا الواحد" کے قانون کے اثبات کے لئے اس ارتباط سے استفادے کے بارے میں) صدر المتألہین کے بیان کی اس تاثیر کا نتیجہ تھا جو میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی جس سے میں وجد کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ مختصر یہ کہ میری فکر میں ایک بنیادی اسلوب پیدا ہو چکا تھا جس نے وسیع و بیکراں کائنات کی وحدت کے بارے میں میری مشکلات کے حل کے لئے امکان کے افق کھول دیئے تھے ان حقائق اور ان سے مربوط دوسرے سلسلۂ حقائق کے ادراک کے نتیجے میں معارف اسلامی کی اصالت و صداقت پر میرا اعتقاد راسخ ہو چکا تھا۔ اور قرآن مجید اور نہج البلاغہ کے توحیدی معارف اور نبی علیہ السلام اور اہل بیت اطہار کی احادیث و ادعیہ کی انتہائی رفعتوں کا مجھے قوی احساس ہو رہا تھا۔

"ایسے میں نے سوچا اور غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اگر میں اس نصاب

تعلیم کو اختیار نہ کرتا اور اس استاد محترم کے فیض تربیت سے محروم رہتا تو ممکن تھا کہ میری دوسری مادی یا ذہنی صلاحیتیں موجودہ حالت سے بہتر ہی ہوتیں۔ کیونکہ وہ سب چیزیں جواب میرے پاس ہیں پہلے بھی تھیں۔ یا کم از کم ان جیسی تو ضرور ہی موجود تھیں لیکن وہ عظیم واہم شئے جو نہ خود کبھی میرے پاس رہی تھی اور نہ اس سے ملتی جلتی کوئی چیز کبھی میرے پاس تھی۔ یہی فکری اسلوب اور اس کے لازمی روحانی نتائج و فوائد تھے۔ اور یہی عقیدہ میرا اب بھی ہے۔"

یہی افکار تھے جوان کے قلب و ذہن میں استاد کے ساتھ عشق اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے اسلام اور اسلامی معارف کے ساتھ متحد ہو گئے تھے اور جنہوں نے پوری قوت سے ان کے قلم، زبان اور عمل کے ذریعے ان کے فکر و عمل کے تمام میدانوں میں اپنی موجودگی کی نشاندہی کی۔

آخر کار استاد مطہری ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ کو ایک عالم کی دختر سے شادی کرتے ہیں اور اپنی پاک اور بے آلایش ازدواجی زندگی کی ابتدا کرتے ہیں۔ شادی سے پہلے وہ مدرسہ فیضیہ کے ایک حجرے میں رہتے تھے، ان کا لباس سادہ اور فقیرانہ تھا لیکن اپنے علمی و روحانی خزانے سے ہزاروں سائلوں کا دامن دلی مسرت اور پوری خندہ پیشانی سے بھرتے تھے۔ شادی کے بعد بھی ان کے اندازِ حیات اور انضباط اوقات میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ بس صرف حجرہ چھوڑ کر ایک کرائے کے کمرے میں منتقل ہو گئے اور اپنی کتابیں بھی وہیں لے گئے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کی زندگی عسرت و تنگدستی میں گزرتی تھی جس کے لیے بعض اوقات اپنی کتابیں تک فروخت کرنے یا دوستوں سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ لیکن عالی ظرفی اور عزتِ نفس کا یہ

عالم تھا کہ اپنی اہلیہ تک کو اس کی خبر نہ ہونے دیتے۔ اور نہ صرف یہ کہ کبھی ان کے سامنے ماتھے پر بل نہیں لائے بلکہ ہمیشہ ان سے بڑی خندہ پیشانی اور شادلب چہرے کے ساتھ شیریں زبانی سے گفتگو کرتے تھے۔

۵۔ قم سے ترک سکونت

باوجودیکہ استاد مطہری کو حوزہ علمیہ قم سے گہرا قلبی اور روحانی لگاؤ تھا اور اپنی زندگی کے آخری دن تک اس حوزہ مقدسہ کی طرف واپسی کی انہیں آرزو رہی لیکن ۱۹۵۲ء میں وہ قم سے تہران ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تہران کی طرف ان کی ہجرت کی حقیقی وجہ کیا تھی؟ یہ ہمیں معلوم نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ مالی تنگدستی تھی اور جس صورتِ احوال کا ہم اوپر جائزہ لے چکے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ دُور از قیاس بھی نہیں۔ لیکن اس مہاجرت کے بعد ان کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا جس کا احساس انہیں روزانہ شدید سے شدید تر ہوتا رہا۔ اِدھر ان کے فیض صحبت سے مستفید ہونے والے ان کے شاگرد ان کی قربت سے محروم ہو کر غم واندوہ میں مبتلا ہو گئے اور ان کے ہم مباحثہ دوست حضرت آیۃ اللہ منتظری جو پورے گیارہ سال تک ان کی مصاحبت سے بہرہ اندوز رہے ان کی جدائی میں تنہائی کے شدید احساس سے دوچار ہو گئے۔

ہر چند کہ یہ مفکرِ عظیم اگر حوزہ علمیہ قم سے ہجرت نہ کرتے تو آج اس حوزہ کی صورت بہت مختلف ہوتی اور وہ معارف اسلامی کی تعلیم اور اسلامی نظریات کی ترویج و حفاظت میں زیادہ مستعد اور طاقتور ہو چکا ہوتا۔ لیکن تہران کی طرف ان کی مہاجرت دوسرے کئی پہلوؤں

سے بہت مفید و نتیجہ خیز رہی جس کا مختصر ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔

۴۔ تہران میں اقامت کا زمانہ (۱۹۵۲ء - ۱۹۷۹ء)

اس مدت کو مندرجہ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

الف - (۱۹۵۲ء - ۱۹۶۲ء)

۱۹۵۲ء کے بعد استاد مطہری کی زندگی کے ابعاد میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی بیش قیمت تصنیفات کی ابتداء، خواہ وہ مقالات کی شکل میں ہوں یا کتاب کی، اسی سال سے ہوتی ہے۔ ان کا اولین مقالہ ۱۹۵۳ء میں قم کے ایک مجلہ "حکمت" میں شایع ہوتا ہے۔ ان کی اولین اہم تصنیف علامہ طباطبائی کی "اصول فلسفہ و روش ریالسم" پر مقدمہ و حاشیہ ہے ـــــ علامہ موصوف کی یہ کتاب اتنی مختصر ہے کہ اکثر لوگوں بالخصوص فلسفہ سے نابلد افراد کے لئے اس کا فہم بہت مشکل ہے، لہٰذا لوگ مولف محترم سے تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی شرح تحریر کی جائے۔ لیکن علامہ کی نگاہوں میں استاد مطہری کے سوا کوئی شخص اس کارِ عظیم کا اہل نہیں چنانچہ وہ یہ ذمہ داری انہیں کے سپُرد کرتے ہیں۔ وہ اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں اور اس کتاب کی پہلی جلد پورے شرح و بسط کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں دوسری جلد ۱۹۵۴ء میں اور تیسری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوتی ہے لیکن پانچویں جلد کی اشاعت ۱۹۷۱ء تک معرض التوا میں پڑ جاتی ہے۔ اور چوتھی جلد بدقسمتی سے استاد شہید مکمل نہ کر سکے اور شائع نہ ہو سکی۔

اس کتاب نے حالیہ دو عشروں میں مادی فلسفہ کی بے بنیادی کے اثبات میں بہت اہم کردار انجام دیا ہے اور استاد مطہری کی عمیق ترین

اور عظیم ترین تحقیقی تخلیق شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے تہران پہنچ کر پہلے ہی سال سے تبلیغ و تدریس شروع کر دی اور ہمیشہ اسلامی معاشرے کی ثقافتی اصلاح کے لئے بنیادی اقدامات کی فکر میں رہے۔

مدرسہ مروی میں ان کا حوزۂ درس اسی زمانے میں قائم ہوا اور وہ مختلف فلسفی فنون از قسم شرح منظومہ، دانشنامۂ علائی اور شفائے بوعلی سینا کی تدریس میں مشغول ہوگئے۔ مدرسہ مروی میں ان کی تدریس کا سلسلہ ان کی شہادت سے تین سال پہلے تک جاری رہا۔

۱۹۵۲ء ہی سے تدریس و تالیف کے ساتھ ساتھ ان کی محققانہ خطابت بھی شروع ہوتی ہے۔ تہران میں ورود کے اولین سالوں میں ان کی تقریریں اگرچہ ان کی اولین تقریروں میں شمار نہیں ہوتیں۔ تاہم اس سال کو ان کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا کا سال کہا جا سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں (۱۹۵۵ء) میں ان کی زندگی کے اطوار میں کچھ بہتری اور مالی کشایش آگئی تھی جس کی صورت بظاہر یہ بنتی ہے کہ وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ ایک فیصلہ کرتے ہیں کہ ہر ایک ایک مذہبی ثقافتی ادارے کے قیام کے لئے ماہوار رقم مہیا کرے اور استاد مطہری ۱۵۰ ریال ماہوار تنخواہ پر اس میں کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔

غالباً ۱۹۵۵ء پہلا سال ہے جس میں آپ کو طلبہ کی اسلامی انجمنوں میں تقریر کرنے کی دعوت ملتی ہے۔ تفسیر قرآن کے موضوع پر طلبہ اسلامی کا پہلا جلسہ استاد مطہری کے توسط سے دسمبر ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوتا ہے۔

نومبر ۱۹۵۵ء میں انہوں نے دانشکدہ معقول و منقول (دانشکدۂ الٰہیات و معارف اسلامی فعلی) میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور ۲۲ سال (۱۹۷۷ء) تک وہاں تدریس و تحقیق میں مشغول رہے لیکن بدقسمتی سے دانشکدہ مذکور ان کے وجود سے کماحقہٗ فیضیاب نہ ہوسکا۔ اگر یہی مدت جو انہوں نے دانشکدہ الٰہیات میں صرف کی اگر حوزہ علمیہ قم میں صرف ہوتی تو بہت بہتر نتائج حاصل ہوتے لیکن بہرحال یہاں بھی انہوں نے اپنا تحقیقی کام جاری رکھا جس کے نتیجے میں چند کتابیں، مقالات اور تحقیقی، دینی، فلسفی اور عرفانی خطبات منظر عام پر آئے۔ ان میں سے ایک کتاب "آشنائی با علوم اسلامی" ہے جو منطق، فلسفہ، کلام، عرفان، فقہ و اصول فقہ پر چھ فصلوں میں ہے اور دوسری "تصحیح و تعلیق کتاب التحصیل" ہے۔

استاد مطہری فلسفۂ مشائین کے واحد متخصص عالم تھے جنہیں شیخ بو علی سینا کی کتب پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ کتاب الشفاء، نجات اور اشارات شیخ کا ڈاکٹریٹ کے طلبہ کو درس دیتے تھے۔ شیخ کی کتب کے علاوہ شرح منظومہ سبزواری اور ملا صدرا کی شواہد الربوبیۃ بھی پڑھاتے تھے۔

سیاسی و اجتماعی تحریکوں میں حصہ لینے کی پاداش میں کئی سال تک ان کی تدریسی سرگرمیوں پر پابندی عائد رہی، لیکن چونکہ وہ مسلط کردہ الزامات سے بالکل بری اور ایک ہمہ گیر علمی شخصیت کے مالک تھے۔ لہٰذا انہوں نے آخر کار لیکچررشپ اور پروفیسرشپ کا مرتبہ دوبارہ حاصل کر لیا لیکن یہ تصرفات اس دانشکدہ کی

افسوس ناک صورت احوال اور دوسری تمام یونیورسٹیوں میں طاغوتی حکومت کے منفی نفوذ کی منہ بولتی تصویر ضرور تھے۔

ان سالوں میں استاد مطہری کی دوسری مفید اور نتیجہ خیز سرگرمیوں میں سے ایک مشترک عوامی سرمایے سے چلنے والی پبلشنگ کمپنی کے ساتھ ان کا تعاون فکری راہنمائی ہے کیونکہ ان کی نظر میں بہترین اور منتخب کتابوں کی نشر و اشاعت اور ان پر نقد و تبصرہ اس ثقافتی ادارے کی بہترین فکری اور اخلاقی اعانت تھی۔ مفید اور سادہ داستانوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کرنے کی تحریک بھی اسی ادارے کی طرف سے ہوئی۔ استاد مطہری اس پر تیار ہو جاتے ہیں اور آخر کار اس کتاب کی پہلی جلد "داستان راستان" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوتی ہے

اور اتنی مقبول ہوتی ہے کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو کر چند ہی روز میں نایاب ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۰ء سے لیکر اب تک بار بار تقریباً ۱۵ مرتبہ چھپ چکی ہے اور یونیسکو کی طرف سے سال کی بہترین تصنیف قرار دی گئی ہے۔

۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو آقائے الحاج میرزا علی آقا شیرازی جو استاد مطہری کو بہت ہی عزیز و محبوب تھے اس دار فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ جون ۱۹۵۶ء میں "اصول فلسفہ در وش ریالزم" کی تیسری جلد شائع ہوتی ہے۔

۱۹۵۷ء میں ادارہ "اشارات مکتب تشیع" قائم ہوتا ہے اور استاد مطہری مقالہ نگاری کے ذریعے اس سے تعاون کرتے ہیں۔ مجلہ "مکتب تشیع" میں شائع ہونے والے ان کے مقالات میں سے

چند یہ ہیں:

۱۔ اصالتِ روح	اپریل ۱۹۵۹ء
۲۔ قرآن و مسئلہ ای ازجہات	اکتوبر ۱۹۵۹ء
۳۔ سال ۱۳۸۱	دسمبر ۱۹۵۹ء
۴۔ توحید و تکامل	بہار ۱۹۶۰ء
۵۔ حق عقل در اجتہاد	سال ۱۹۶۳ء

۱۹۵۹۔ ۱۹۶۰ء میں جب انجمن اطبائے اسلامی کی تشکیل ہوئی تو استاد مطہری اس کے اہم ترین لیکچراروں میں سے تھے۔ اور ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۱ء تک انجمن مذکور کے تقریباً اکیلے لیکچرار تھے۔ اور فکری، فلسفی، نظریاتی مسائل جیسے اہم اسلامی مسائل مثلاً اصول پنجگانہ توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت؛ قرآن کی نظر میں عورت کا مقام؛ "اقتصاد اسلامی"؛ اسلام میں بیمہ اور بنکنگ" اور" اسلام میں غلامی"۔ جیسے مسائل پر بحث اور اظہار خیال کرتے تھے۔ ان خطبات کا ایک چھوٹا سا حصّہ "مسئلہ حجاب" کے نام سے کتابی صورت میں عوام تک پہنچا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک اسلامی تحریکیں زور پکڑتی جاتی ہیں۔ اور اُستاد مطہری بھی دوسرے فعّال علمائے دین کے دوش بدوش یونیورسٹیوں، مساجد، مکتب توحید کے جلسوں، ماہوار تقریری اجتماعات اور دوسرے بہت سے مقامات پر تعلیم و تبلیغ اور عوام کے ذہنوں کی تنویر میں بھرپور کردار انجام دیتے ہیں۔

(ب): (۱۹۶۳ء ـــــ ۱۹۷۲ء)

اس دور میں جو ۱۹۶۳ء کے اوائل میں شروع ہوتا ہے۔ استاد مطہری کی سیاسی اور اجتماعی فعالیت اور ان کی اسلامی اور ثقافتی

خدمات ہر رُخ سے وسعت اختیار کرتی ہیں، ۲۲ جنوری ۱۹۶۲ء کے واقعے کے بعد امام خمینی کی قیادت میں روحانی جنگ نیا رُخ اختیار کرتی ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ پھر ۹ اپریل ۱۹۶۳ء سے طلبا کی گرفتاری، فوجی بیرکوں میں ان کی نظر بندی اور حکومت کے ساتھ ان کی جھڑپیں تسلسل اختیار کر لیتی ہیں حتی کہ ۶ جون ۱۹۶۳ء (۱۲ محرم ۱۳۸۳ھ) کا واقعہ پیش آیا ہے۔ استاد مطہری نے اس مدت میں رونما ہونے والے واقعات میں بڑا نمایاں کردار انجام دیا۔ جب انقلابی طلبہ باغشاہ کی فوجی چھاؤنی میں قید تھے تو وہ ان سے ملاقات کے لئے جاتے اور انقلاب کے لئے جہاد میں ان کی راہنمائی کرتے تھے۔ ۶ جون کی بغاوت میں انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ لیکن حکومتِ وقت کو ان کی سرگرمیوں کے صرف ایک گوشے کا سُراغ ملا جس کی پاداش میں انہیں ۶ جون کو بروز بدھ آدھی رات کے وقت پولیس نے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ اُستاد مطہری کی گرفتاری سے پہلے پانچ چھ دوسرے علماء بھی گرفتار ہو چکے تھے اور اس کے بعد بھی بہت سے گرفتار ہوئے۔

ان علماء کے خلاف فردِ جُرم کی فائل کا ایک حصّہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے خطبے "من رای سلطاناً جابراً....." کی تلقینات کے مطابق جابر حکومت کے خلاف تقریروں کے الزامات پر مشتمل تھا جن میں عوام کو شاہ اور اس کی ظالمانہ حکومت کے خلاف مسلح بغاوت پر اُکسایا گیا تھا لیکن ملک کے مختلف شہروں کے علماء کے تہران میں اجتماع اور عوامی دباؤ نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ اکثر زندانیوں کو رہا کر دے۔

اسی عمومی رہائی میں اُستاد مطہری بھی ۱۷ جولائی ۱۹۶۳ء کو شام

کے چھ بجے تھانے کی حوالات سے آزاد ہو جاتے ہیں اور چھ اگست کو بروز منگل عید سعید میلاد نبوی کے دن، پانچ امیر الامراء کے کوچے کے سامنے ایک مکان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ امام خمینی بھی عشرت آباد کے زندان خانے سے رہا ہو کر داوودیہ میں ایک مکان میں اور ازاں بعد قیطریہ کے ایک مکان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

اب امام کا رابطہ عوام سے منقطع تھا اور حکومت کے خلاف قیام میں قوم کی قیادت کی ذمہ داری استاد مطہری جیسے دوسرے درجے کے رہنمایان ملت کے سر پہ آن پڑی تھی۔ یہاں سے ہمیں کچھ دور ماضی میں جانا ہو گا۔ حوزہ علمیہ قم میں قیام کے زمانے میں ۱۹۴۶ء سے ایران میں تحریک آزادی کی وسعت پذیری کے ساتھ ساتھ استاد مطہری کے سیاسی افکار میں بھی وسعت و بلندی پیدا ہو رہی تھی۔ چنانچہ قم میں اپنے قیام کے آخری سالوں میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت کے دوران سیاسی نشیب و فراز کے تمام مراحل میں وہ شروع سے آخر تک ثابت قدم رہے۔ اس وقت جبکہ آیت اللہ کاشانی جیسی شخصیتیں نیز فدائیان اسلام بھی تغیر پذیر سیاسی اوضاع و اطوار میں مؤثر کردار انجام دے رہے تھے تو اُستاد مطہری جیسا انسان جو اسلام اور اس کی زندگی بخش تعلیمات کا عاشق تھا، اسلامی حکومت کی آرزو کی اپنے دل میں پرورش کر رہا تھا اور پورے طور پر پُر امید تھا کہ یہ تحریک آزادی یقیناً ایک خالص اسلامی حکومت کو وجود میں لائے گی لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ

ہو سکی۔ ان دنوں ان کے وقت کا بہترین اور بیشتر حصّہ لیکچروں میں اور اعلامیوں اور روزناموں کے مطالعے میں گذرتا تھا اور سیاسی مقالات کے مطالعے کے علاوہ وہ ان کے بارے میں اپنے دوستوں سے مباحثہ بھی کرتے تھے۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے مسلمانوں کے انحطاط کے علل و عوامل پر غور کر رہے تھے۔ کسی بھی واقعے سے بے توجہ نہیں رہتے تھے اور تمام مشکلات کا بغور مطالعہ کرکے اور اس کے اسباب معلوم کرکے اس کے لئے حل کی راہ متعین کرتے تھے۔ قم میں ان کے قیام کے آخری پانچ سالوں کو مشکلات، وسائل کی کمی اور نارسائی کے علل و اسباب کے فہم و احساس کا زمانہ کہا جا سکتا ہے اور تہران میں قیام کے زمانے کو، جیسا کہ ان کی کتاب "انسان و سرنوشت" کے مطالعے سے مستفاد ہوتا ہے۔ ان نقائص کے ازالے کی جدوجہد اور ان کے فکری اسلوب کی تکمیل کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بنیادی عوامل میں سے ایک جو ایران کے اسلامی معاشرہ کی پیش رفت یا پسماندگی کا ذمہ دار رہا ہے، علمائے اسلام کا کردار ہے۔ ایران میں علماء کی جماعت کو بڑا اثر و نفوذ حاصل ہے۔ ایک طرف تو وہ لوگوں کی دینی رہنمائی اور اسلامی تعلیمات کو اجاگر کرنے کی ذمہ دار ہے اور دوسری طرف اسے عوامی اعتماد حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ ایرانی سیاست میں بھی بنیادی کردار انجام دے سکتی ہے۔ استاد مطہری اس حقیقت کو پا چکے تھے اور وہ حوزۂ علمیہ قم میں تحصیل علم کے زمانے ہی سے ہمیشہ حوزہ کی

سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کے محاسن و معائب پر غور کرتے تھے۔ تہران میں قیام کے دوران انہوں نے حوزہ کے نقائص کو دور کرنے کی عملی کوشش کی۔

۱۹۶۳ء میں جبکہ امام کا رابطہ عوام سے کٹ چکا ہے، سب سے بڑی ذمہ داری استاد مطہری جیسے افراد پر آپڑتی ہے۔ یہ بہترین موقع ہے کہ وہ اپنی سکیموں کو عملی جامہ پہنائیں۔ یہ قم اور تہران کے طبقہ علما کی مرکزی طاقت کے عروج کا وقت ہے۔ وہ لوگوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں جس کے بعد دوسرے شہروں میں علماء کی تنظیمیں وجود میں آتی ہیں۔ استاد مطہری کو اس عمل کا موجد اور منتظم جاننا چاہیے۔

استاد مطہری نے علماء کی تنظیم کے بارے میں اپنے نظریات اپنی کتاب "مرجعیت وروحانیت" کے ایک مقالے میں تحریر کئے ہیں۔

استاد مطہری کا ایک اور اہم کردار وہ ہے جو انہوں نے اسلامی انجمنوں کو ایک وحدت "موتلفہ" میں منظم کرنے میں انجام دیا۔ اس تنظیم کا تحریک اسلامی کی توسیع میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ وہ چند دوسری روحانی شخصیتوں کے ہمراہ امام کی طرف سے اس تنظیم کی ہدایت ورہبری پر مامور ہوئے۔

ایسے موقعہ پر استاد مطہری جیسی شخصیت کا وجود بہت غنیمت اور راہ کشا تھا کیونکہ وہ ایک برموقعہ اقدام کرنیوالے اور کاروان انسان بھی تھے، روحانی حلقوں میں خاص عزت و احترام کے حامل بھی تھے، اسلامی تحریک کی توسیع کے دل سے عاشق

اور شیدائی بھی تھے ، موتلفہ کے معتمد بھی تھے اور روشن فکر لوگوں سے بھی رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

آخر کار امام اُمت عوامی دباؤ اور علماء کی جدوجہد کے نتیجے میں چند ماہ گزرنے کے بعد آزاد ہوکر قم واپس آجاتے ہیں لیکن اپنی انقلابی مہم بدستور جاری رکھتے ہیں حتی کہ "قانون" کاپیٹولا سیون" کو چیلنج کر دیتے ہیں جس کی پاداش میں حکومت وقت امام کی جلا وطنی کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔

امام کی ترکیہ میں جلا وطنی کے بعد استاد مطہری کی ذمہ داریاں سنگین تر ہو جاتی ہیں کیونکہ سب کاموں کا پوری توجہ اور غور و تدبر کے ساتھ اِردگرد کے احوال کے مطالعے کے بعد انجام پانا ضروری ہے۔ امام کی جلا وطنی کے بعد پہلے رمضان المبارک کے مہینے میں ملک کے وزیر اعظم منصور ایک شخص شہید بخارائی کے ہاتھوں گولی لگنے سے جاں بحق ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں موتلفہ کی قیادت کا سارا نظام معطل ہو جاتا ہے اور حکومت وقت کے خلاف استاد مطہری کا موتلفہ کے ساتھ گٹھ جوڑ بھی آشکار ہو جاتا ہے جس کے بعد سے وہ مستقل طور پر حکومت کے قہر و غضب کا نشانہ بن جاتے ہیں اور ساواک کے کارندوں کی کڑی نگرانی کی زد میں آجاتے ہیں۔

استاد مطہری بنیادی اہمیت کے تعمیری اقدامات کے قائل تھے، ہمیشہ تعمیری انداز میں سوچتے اور عملی جدوجہد اور باطل کے خلاف مجاہدانہ قیام کے امکان کو کبھی نظر انداز نہ کرتے تھے۔ ان کے کندھوں پر بڑی ذمہ داری آن پڑی تھی جس سے عہدہ برآ ہونے کے

لئے انہیں ایک قابل، اسلام شناس اور سچے عالم دین کی حیثیت سے کام کرنا تھا نیز حقیقی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھی سخت محنت کرنا تھی، لہٰذا وہ اس فکر سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ اب ہم ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۲ء تک کی ان کی ثقافتی خدمات کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ یونیورسٹیوں، انجمن اطبائے اسلامی، مسجد ہدایت، مسجد نارمک اور دوسری مساجد میں علمی و تبلیغی خطبے۔

۲۔ مقالات کی نشر و اشاعت از قسم:

(الف) اجتہاد اور اجباری گری (کتاب "مرجعیت و روحانیت)

(ب) مشکل اساسی در سازمان روحانیت (کتاب "مرجعیت و روحانیت)

(ج) علاقہ جنسی (مکتب اسلام ۱۹۶۵ء)

(د) اخلاق جنسی ۔ ۷ مقالات (مکتب اسلام ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۶۶ء)

(ہ) ایران و اسلام ۳ مقالات ۔ (مکتب اسلام ۱۹۶۶ء)

اور کچھ مقالات جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

۳۔ اسلامی کتابوں کی اشاعت مثلاً:

(الف) داستان راستان جلد ۲ (اکتوبر ۱۹۶۴ء)

(ب) انسان و سرنوشت (۱۹۶۶ء)

(ج) خورشید دین ہرگز غروب نمی کند (۱۹۶۶ء)

(د) امداد ہائے غیبی در زندگی بشر (۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء)

(ہ) مسئلہ حجاب (فروری ۱۹۶۸ء)

(و) عدل الٰہی (۱۹۷۰ء)

(ز) جاذبہ و دافعہ علیؑ (فروری ۱۹۷۰ء)

(ح) خدمات متقابل اسلام و ایران (۱۹۷۰ء)

(ط) تصحیح و تعلیق کتاب التحصیل (۱۹۷۰ء)
(ی) علل گرایش بہ مادی گری (۱۹۷۱ء)
(ک) اصول فلسفہ و روش ریالزم (۵ جلد) (۱۹۷۱ء)

۴۔ حسینیہ ارشاد کا قیام:

استاد مطہری کئی سال سے معارف اسلامی کی تعلیم کے لئے ایک اسلامی تحقیقی مرکز کے قیام کی فکر میں تھے اور ان افراد میں سے تھے جنہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے بہت اہم کردار انجام دیا۔ وہ اس ادارے کی انتظامیہ کے رکن تھے اور انہیں پوری اُمید تھی کہ یہ اسلامی مرکز اسلام اور اس کی آئیڈیالوجی کی تعلیم میں کامیاب ہوگا لہٰذا وہ اسے بہترین طریقے سے چلانے کے لئے اپنا پورا وقت مکمل تن دہی اور سوز و عشق سے اس راہ میں وقف کئے ہوئے تھے۔ وہ اس کے تمام امور میں پوری باریک بینی اور غور و تدبر سے فکر کرتے تھے اور اس کے بارے میں اپنی تنقیدات دوسرے منتظمین کے سامنے رکھتے تھے۔ لیکن آخرکار انہیں اس تعلیمی مرکز کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا پڑا۔

مسلمان دانشوروں اور مفکروں کی دعوت پر استاد مطہری نے اس ادارے کے انتظام و انصرام میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا۔ انہوں نے اس میں کئی لیکچر دیئے جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ تحریفات در واقعۂ تاریخی عاشورا
۲۔ حماسۂ حسینی۔
۳۔ جاذبہ و دافعہ علیؑ

۵ مسجد الجواد کی نگرانی کے فرائض:

استاد مطہری ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء تک مسجد الجواد کے تبلیغی پروگراموں کے نگراں رہے اور اکثر اوقات خود ہی وہاں کی خطابت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ ان کے خطبات کا موضوع زیادہ تر قرآنی حقائق ہوتا تھا۔ ان کے بعض خطبے تفسیر قرآن کے عنوان سے بھی ہیں۔

مندرجہ بالا سرگرمیوں کے علاوہ استاد مطہری ملت اسلامی کی سیاسی اور اجتماعی مشکلات کے بارے میں بھی فکرمند رہتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں خانماں برباد فلسطینی مسلمانوں کی مدد کے لئے چندہ جمع کرنے کی اپیل پر حضرت علامہ طباطبائی اور الحاج سید ابوالفضل مجتہد زنجانی کے دستخطوں کے ساتھ ان کے دستخط بھی شائع ہوئے۔ امام کے ساتھ ان کا رابطہ اس تمام مدت کے دوران برقرار رہا اور ان کے ساتھ باہمی خط و کتابت بھی جاری رہی۔

متعدد خطبات اور انجمن اطبائے اسلامی کے جلسوں کے علاوہ جو ہفتے میں دو بار منعقد ہوتے تھے، ایک ہفتہ وار جلسۂ تفسیر بھی تھا جو ان کی زندگی کے آخر تک پورے پندرہ سال جاری رہا۔ یہ تفسیر سورہ حج سے شروع ہوئی تھی (اس سے پہلی سورتوں کی تفسیر ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی کے ہاتھوں مکمل ہو چکی تھی)، اور والناس پر اختتام پذیر ہوئی۔ افسوس ہے کہ ایسے بصیرت افروز جلسے آج کل بہت شاذ ہیں۔

۲۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو بروز جمعہ استاد مطہری کے والد محترم فریمان میں رحمت حق تعالیٰ سے جا ملتے ہیں اور علماء اور سربرآوردہ شخصیات کی طرف سے نیز مراجع تقلید حضرات اور امام خمینی کی جانب سے استاد مطہری کو اس فقدان عظیم پر تعزیت کے تار موصول ہوتے ہیں۔

۱۹۷۲ء ــــ ۱۹۷۸ء

۱۹۷۲ء میں حکومت کی طرف سے مسجد الجواد کے تمام پروگرام منسوخ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سے کچھ مدت بعد حسینیہ ارشاد پر بھی پابندی عائد کر دی جاتی ہے، استاد مطہری گرفتار ہو کر قید ہو جاتے ہیں، لیکن تھوڑی مدت کے بعد رہا کر دیئے جاتے ہیں۔

ان چند سالوں میں نہضت اسلامی کی ترقی اور صحیح اسلامی خطوط پر جدوجہد کو جاری رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سے حکومت کے دباؤ اور جبر و تشدد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے مجاہدین اور طلبہ قید خانوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں اور بات تک منہ سے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے نیز اسی دوران میں استاد مطہری کے یار باوفا حضرت آیۃ اللہ منتظری قید ہو جاتے ہیں۔ بہت سے علماء کا منبر پر آنا ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ خود استاد مطہری کو بھی ۱۹۷۷ء سے پہلے کچھ مدت کے لئے منبر پر آنے سے ممانعت کر دی جاتی ہے۔

دوسری طرف سے حکومت کے دباؤ اور جبر و جور کے باوجود عوامی جدوجہد اور تحریک انقلاب کی صحیح سمت میں راہنمائی اور ہر قسم کے انحراف سے خبردار رہنا بھی ضروری ہے۔ استاد مطہری ان سب پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی راہِ عمل متعین کرتے تھے۔ ایک طرف سے امام کے ساتھ ان کا رابطہ قائم تھا حتیٰ کہ ۱۹۷۶ء میں بہت سی مشکلات کے باوجود وہ نجف پہنچ کر امام کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل کرتے ہیں

امام بھی غیر معمولی توجہ و اعتماد کے ساتھ جوان پر انہیں تھا اور جس کی وجہ سے انہیں اپنی "عمر کا حاصل" قرار دیتے تھے۔ مختلف مسائل اور حوزہ علمیہ کے درسی اسلوب کے بارے میں اپنی تجاویز و نظریات ان کے سامنے پیش کرتے تھے

علاوہ ازیں وہ خود بھی بڑی سُوجھ بوجھ والے تھے اور آنے والے خطرات کی پیش بینی کر لیتے تھے۔

ان سالوں کے دوران ان کی اہم ترین خدمت درس و تدریس، خطابت اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اسلام کی حقیقی آئیڈیولوجی کی وضاحت تھی جس سے وہ بڑی خوش اسلوبی سے عہدہ برا ہوتے۔ ان سالوں میں انہوں نے تہران میں بہت اہم درس دیئے جو اچھوتے اور پُر مغز تھے۔ ان میں سے اہم ترین درس یہ ہیں۔

۱۔ درس اسفار (قم)
۲۔ فلسفہ تاریخ از دیدگاہ قرآن۔
۳۔ درس منظومہ (اسلامی اور مغربی فلسفے کے تقابلی مطالعے کے ساتھ)
۴۔ درس شفاء (مدرسہ مروی)
۵۔ معارف قرآن (قم)
۶۔ اقتصاد اسلامی (تہران)
۷۔ درس مارکسزم (قم)

ان سالوں میں شائع ہونے والے ان کے مقالات اور کتب میں سے کچھ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سیری در نہج البلاغہ
۲۔ قیام و انقلاب مہدی
۳۔ مقالۂ شہید
۴۔ نظام حقوق زن در اسلام
۵۔ الغدیر و وحدت اسلامی

آخری سالوں میں مرحوم ڈاکٹر محمد مفتح استاد مطہری کے بہت

قریبی ساتھی تھے۔ مسجد جاوید اور مسجد قبا ان مراکز میں سے تھیں جو آقای مفتح کی زیر نگرانی چلتے تھے اور وہ ان کے اداری امور میں استاد شہید مطہری کی ہدایات سے براہ راست مستفید ہوتے تھے

۱۹۷۸ء سے شہادت تک

اس دور میں ان کی سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آجاتی ہے۔ وہ تہران کی ہیئت علماء کے رکن تھے اور امام کے ساتھ علماء کے رابطے کا وسیلہ تھے۔ انقلاب کی ابتداء کے زمانے سے جو الحاج سید مصطفیٰ خمینی کی شہادت کے بعد شروع ہوتا ہے، انقلاب کی ترقی اور اس کی رہبری میں تہران کے علماء کا کردار بڑا اہم تھا اور ان کے فیصلوں میں استاد مطہری کے مشوروں اور ہدایات کا بڑا ہاتھ تھا۔ تمام اہم فیصلے اور آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں علماء کے اعلامیے اور دیگر مسائل کے حل کے لئے ان کی تجویزیں اور قراردادیں نظر ثانی اور منظوری کے لئے استاد مرحوم کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔

امام کی پیرس مہاجرت کے بعد استاد مطہری پیرس جاتے ہیں اور انقلاب کے اہم مسائل پر امام سے مشورہ کرتے ہیں۔ امام بھی اپنی صوابدید اور نظریات ان کے ملاحظے میں لاتے ہیں۔

انقلاب کی فتح سے پہلے امام کی طرف سے انقلاب کی شوریٰ کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی جس سے وہ پوری کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے حتیٰ کہ امام تہران واپس آگئے۔ امام کی واپسی کے بعد بھی وہ ہمیشہ دبیرستان علوی میں امام کے ہمراہ اور ان کے شریک کار رہتے تھے۔

اس دوران میں ان کی حسب ذیل تصنیفات شائع ہوئیں:

۱۔ نہضت ہائے اسلامی در صد سالۂ اخیر۔
۲۔ انسان و ایمان
۳۔ جہاں توحیدی۔
۴۔ وحی و نبوت

آخر کار اردیبہشت ۱۳۵۸ (۲۹ مئی ۱۹۷۹ء) کو ۱۰ بج کر پانچ منٹ پر ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ رحمتِ حق تعالیٰ سے جا ملے وقت آخر حضرت علی علیہ السلام کے الفاظ "فزت برب الکعبہ" ان کی زبان پر جاری تھے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بیخود از شعشۂ پرتو ذاتم کردند
بادہ از جامِ تجلی صفاتم دادند

(کل سحر کے وقت مجھ کو رنج سے راحت ملی
ظلمتِ شب میں جو آبِ زیست کی نعمت ملی
پرتوِ نورِ ازل نے مجھ کو بے خود کر دیا
بادۂ نورِ صفاتِ ذات سے عزت ملی)

ان کی شہادت کے بعد ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ انسان در قرآن ۲۔ زندگی جاوید یا حیاتِ اخروی
۳۔ آشنائی با علوم اسلامی، جلد ۱۔ ۴۔ آشنائی با علوم اسلامی، جلد ۲
۵۔ انقلاب اسلامی۔

والسلام علیٰ عبادہ الصالحین

حضرت آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہری

کی شہادتؒ پر

مجاہد عظیم حضرت آیۃ اللہ منتظری کا

اعلامیہ

۵ جمادی الثانی، ۱۳۹۹ھ۔ ۱۲/۲/۱۳۵۸ھ۔ (۳۰ مئی ۱۹۷۹ء)

حضرت آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہری کی شہادت پر مجاہد عظیم حضرت آیۃ اللہ منتظری کا اعلامیہ

وَلاتقولوالمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لاتشعرون

اذامات المومن الفقیہ ثلم فی الاسلام ثلمۃ لایسدھا شیٔ

مجاہد بھائیو اور بہنو!

ایک بار پھر مجرم ہاتھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ ایک بہت خوفناک اور روح فرسا ظلم کا ۔۔۔ جو یقیناً ملت مسلم ایران کے انقلاب کی تاریخ کا رخ بدل دے گا۔

ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ کی ۴ تاریخ کو نصف شب کے قریب انقلاب اسلامی ایران کے آسمان سے ایک درخشاں ستارہ غروب ہوگیا۔ ایک ایسے مجاھد عظیم کا پُر جلال چہرہ ہم سے پوشیدہ ہوگیا جو رہبر انقلاب حضرت امام خمینی کا دستِ راست اور ان کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھا۔ ایک ایسا عظیم مفکر اور دانشور ہم سے جُدا ہوا ہے کہ جس کی شہادت نے دین و دانش اور تقویٰ و انقلاب کی دنیا کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

جنت مقام، شہید عظیم حضرت آیۃ اللہ الحاج شیخ مرتضیٰ مطہری خراسانی گزشتہ رات نصف شب کو مجرموں کے ہاتھوں شہدائے راہ حق کے قافلے سے جا ملے۔ کل تک جو لشکرِ اسلام کے سالار اور اس صدی کے ولی تھے، آج شہادتِ عظمیٰ پر فائز ہوچکے ہیں۔ کیا کہا جاسکتا ہے کہ خارجی استعمار کے سازشی

گماشتے کل کیا گل کھلائیں اور کیسے کیسے مزید عظیم انسانوں کو شہادت سے ہمکنار کردیں ؟

آیا اس سب کچھ کی ذمہ داری برساتی مینڈکوں کے ان گروہوں پر عائد ہوتی ہے جو ان دنوں سرزمین ایران کے سٹیج پر ظاہر ہو کر پتلیوں کا ناچ ناچتے ہیں یا اس کا ذمہ دار مشرق و مغرب کی بساط سیاست کا کوئی شاطر بیرونی ہاتھ ہے جو ان کٹھ پتلیوں کے ذریعے اپنی جنگی سیاست اور شیطانی سازشوں کو عمل میں لا رہا ہے۔

بہت جاہلانہ بات ہوگی کہ ہم امریکی امپیریالزم، سی آئی اے کے گماشتوں اور صیہونزم کے پٹھوؤں کے نقوش قدم کو جو جمہوری اسلامی ایران میں بائیں بازو کے مختلف گروہوں اور امریکی مارکسی جماعتوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں ختم کرکے اصل مجرم تک پہنچنے کی راہ مسدود کردیں۔ استعمار کے گماشتوں اور ان کے آقاؤں کو یہ حقیقت خوب جان رکھنی چاہئے کہ ایران کے بہادر مسلمان اپنے اسلامی سیاسی رشد و شعور کی وجہ سے ان سے مزید فریب زدہ نہیں ہوں گے اور اپنے انقلاب کو ہر قیمت پر جاری رکھیں گے تاکہ جرم و استعمار کی مکمل طور پر بیخ کنی کرسکیں۔

اسلامی انقلاب جیساکہ رہبر انقلاب حضرت امام خمینی نے فرمایا ہے کسی فرد یا جماعت سے وابستہ نہیں ہے بلکہ لاکھوں مرد و زن کا انقلاب ہے جنہوں نے ایمان، جہاد، محرومیت، خون و شہادت، زندان و عذاب اور صبر و استقلال سے تاریخ عالم کے سب سے بڑے اسلامی انقلاب کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا ہے۔

ایران کے اسلامی انقلاب کی شکست صرف ایران کی یا انقلاب اسلامی کی شکست نہیں ہے، بلکہ جملہ مسلمانان عالم اور مستضعفین دنیا کی ذلت و رسوائی

اور حسرت و یاس کا سامان ہے کیونکہ اس انقلاب نے ان کی بہت سی اُمنگوں اور آرزوؤں کو پورا کیا ہے اور ان کو بڑے بیش قیمت تجربات اور سبق سکھائے ہیں آیۃ اللہ مطہری جیسی عظیم شخصیتوں کی شہادت سے واقع ہونے والے نقصانات صرف ایرانی عوام ہی کو غمزدہ نہیں کرتے بلکہ دنیا میں موجود اسلامی اور ملی آزادی کی تحریکوں اور حریت پسند انسانوں کو رنج و اندوہ میں مبتلا کرتے ہیں ۔

عالمی سازش کار اور بین الاقوامی تخریب کار غنڈے اگر یہ سمجھتے ہیں کہ چند مجاہد افراد کو قتل کر کے پوری قوم کے عزم صمیم کو متزلزل کیا جا سکتا اور اپنے مقصد کے حصول سے انہیں باز رکھا جا سکتا ہے تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے ۔ انھیں خوب یاد رکھنا چاہئے کہ یہ قتل و غارت اور تخریب کاریاں ملت مجاہد کے عزم کو مصمم تر اور درخت انقلاب کو مزید بارآور بنائیں گی جیسے کہ سید الشہدا علیہ السلام کے مقدس خون سے اسلام کی نہضت مقدسہ کی جڑیں مزید مضبوط و محکم اور پائیدار ہو گئیں۔

ایران کی ملت مسلمہ بیدار ہو چکی ہے، اس نے اپنی راہ متعین کر لی ہے اور اب وہ جلد ہی مجرموں کا احتساب کرے گی اور انہیں بازپرس کے کٹہرے میں کھڑا کرے گی۔

میں اس عظیم مصلح قوم اور عہد آفرین شخصیت کی شہادت پر حضرت قائم آل محمد علیہم السلام (عجّل اللہ فرجہ الشریف)، حوزات علمیہ، علمائے اسلام بالخصوص رہبر انقلاب اسلامی حضرت امام خمینی، شہید مظلوم کے پسماندگان، پوری ملت اسلامی ایران اور مسلمانان عالم کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

بہت مناسب ہے کہ ملتِ ایران بدھ، جمعرات اور جمعہ پورے

تین روز عظیم شہید کی عزاء میں سوگ نشیں ہو۔

ہمیں اطمینان ہے کہ ملت ایران اور دوسری قومیں اپنے اسلامی اور اخلاقی فرائض کی اس عظیم سانحے کے حوالے سے تشخیص و تعیین کریں گی۔

والسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ،

قم ۔ حسین علی منتظری